جنوری ۸۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیتِ داعیٔ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

★ تذکرہ و تبصرہ (سیاسی صورت حال پر امیر تنظیم کا تبصرہ اور مشورے)

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

نام بھی اچھا — کام بھی اچھا
صُوفی سوپ ہے سب سے اچھا

صُوفی سوپ

اُجلی اور کم خرچ دُھلائی کے لیے بہترین صابن

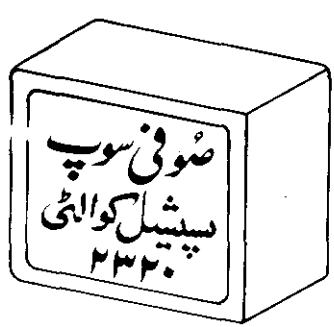

صُوفی سوپ اینڈ کیمیکل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
تار: صُوفی سوپ ٹیلکس:
۳۹۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور ٹیلی فون نمبر: ۲۲۵۴۴۷۔ ۵۴۵۲۳

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جس سے تم نے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار

جلد: ۳۸

شمارہ: ۱

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

جنوری ۱۹۸۹ء

فی شمارہ ۵/-

سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/=
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel : 312 969 6755

CANADA US $ 12/=
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2Z2
Tel : 416 531 2902

MID-EAST DR 25/=
c/o Mr. M.A. Javed
JKQ P.O. Box 4699
Dubai UAE
Tel : 459 112

K S A SR 25/=
c/o Mr. M. Rashid Umar
P.O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

INDIA US $ 6/=
c/o Mr. Hyder M. D. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel : 42127

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel : 313 977 8081

UK & EUROPE US $ 9/=
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel : 01 805 8732

ABU DHADI (only) DR 25/=
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

JEDDAH (only) SR 25/=
c/o Mr. M.A. Habib
CC 720 Saudia P.O. Box 167
Jeddah 21231
Tel : 651 3140

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

★ عرضِ احوال ——— ۵
یہی ہے رختِ سفر.....
اقتدار احمد
★ تذکرہ و تبصرہ ——— ۱۱
(i) تصویر کے دو رخ
(ii) موجودہ سیاسی حالات میں مذہبی اور دینی جماعتوں کے لئے لائحہ عمل
امیرِ تنظیم اسلامی کے دو اہم خطابات
★ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت داعیٔ انقلاب ——— ۵۱
امیرِ محترم کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب
ترتیب و تسوید : (شیخ) جمیل الرحمٰن
★ آخرت پر ایمان (آخری قسط) ——— ۷۱
محمد غوری صدیقی
★ رفتارِ کار ——— ۷۷
تیز ترک گامزن ——— کراچی میں تنظیم اسلامی کی تربیت گاہ
اور انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام محاضراتِ قرآنی کی رپورٹ
مرتب : رحیم کاشفی
★ خطوط و نکات ——— ۸۷
"جا ایں جاست"
ریاض (سعودی عرب) سے محترم اختر ہاشمی کا مفصل مکتوب
"مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ" ۹۳
اٹک سے محترم قاضی زاہد الحسینی کا مکتوب
"ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات" ۹۴
"فرنٹیر پوسٹ" پشاور میں شائع شدہ مکتوب

رفقاء واحباب نوٹ فرمالیں

اِمسال مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

سالانہ محاضراتِ قرآنی

ان شاء اللہ العزیز لاہور میں ۲۴ تا ۲۸ مارچ ۸۹ء

اور

تنظیم اسلامی کا

چودھواں سالانہ اجتماع

لاہور ہی میں ۲۹ اور ۳۰ مارچ کو منعقد ہوگا

محاضراتِ قرآنی منعقدہ ۱۷ تا ۲۱ دسمبر ۸۸ء کراچی میں

اسلام کا نظامِ حیات

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطابات کے

آڈیو اور ویڈیو کیسٹس

تیار کر لئے گئے ہیں

عنوان	آڈیو کیسٹ	قیمت	ویڈیو کیسٹ	قیمت
اسلامی نظام کی نظریاتی اساس	۲ (سی-۹۰)	۴۰/-	۱ (ای-۱۸۰)	۱۷۵/-
اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
میزان :	۱۰ 〃	۲۰۰/-	۵ 〃	۸۷۵/-

ڈاک کے ذریعے منگوانے کی صورت میں آڈیو کیسٹس کے سیٹ کے لئے -/۱۵ روپے اور ویڈیو کیسٹس کے سیٹ کے لئے -/۲۰ روپے ڈاک خرچ ادا کرنا ہوگا۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون ۸۵۶۰۰۳

انجمن خدام القرآن سندھ ۔ ۱۱ ۔ داؤد منزل شاہراہ لیاقت، کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

عرضِ احوال

اقتدار احمد

یہی ہے رختِ سفر . . .

تنظیم اسلامی پاکستان کا چودھواں سالانہ اجتماع توانشاءاللہ ۲۹۔ ۳۰؍ مارچ ۱۹۸۹ء کو لاہور میں ہوگا اور اس کے ساتھ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے محاضرات قرآنی کے لئے ۲۴ تا ۲۸؍ مارچ کی تاریخیں طے ہوئیں ہیں لیکن انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام کراچی میں پچھلے ماہ ۱۷ تا ۲۱؍ دسمبر ۱۹۸۸ء کو جو محاضرات قرآنی "اسلام کا نظام حیات" کے موضوع پر ہوئے ' انہوں نے بھی تنظیم اسلامی کے رفقاء کو مل بیٹھنے کا اچھا موقع فراہم کر دیا۔ ملک کے کونے کونے سے ہمارے ساتھی سمٹ آئے تھے اور اگرچہ سب کے لئے اس پروگرام میں شرکت لازم نہ تھی ' تاہم ترغیب و تشویق کے نتیجے میں اُن سب لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جانا جو استطاعت و فراغت کا انتظام کر سکے اور یوں اس اجتماع میں ہر علاقے کی نمائندگی بہر حال بھرپور ہو گئی۔ شام کی نشستیں امیر تنظیم اسلامی اور انجمن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے پانچ لیکچروں پر مشتمل تھیں اور دن کے یومیہ دو پروگرام تربیتی نوعیت کے تھے۔ اول الذکر میں سامعین کی کثیر تعداد شریک ہوتی رہی اور مؤخر الذکر تنظیم کے وابستگان کے لئے مخصوص تھے۔ ان کی نسبتاً تفصیلی روداد "میثاق" کے زیر نظر شمارے میں ہی مل جائے گی ' یہاں ان کے بارے میں محض دو پہلوؤں پر گفتگو مقصود ہے۔ ایک یہ کہ تنظیم اسلامی میں اجتماعیت کی بنیاد مقبول عام دستوری و جمہوری انداز کے برعکس بیعت کی مسنون نہج پر ہونے کے باوجود مشاورت و احتساب کا وہ قابل عمل نظام کار فرما ہے جو سیاسی جماعتوں میں تو کیا نظر آتا ' آج کی مذہبی جماعتوں اور دینی تحریکوں میں بھی موجود نہیں۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر بجا لائیں ' کم ہے لیکن بہر حال یہ نعمت اتباع سنت کی برکات میں سے ایک ہے۔ اس پہلو کی تفصیل اور مشاورتی و احتسابی مجالس کی نوعیت و کیفیت کا ذکر بشرط زندگی کسی اور موقع پر ہو گا۔ دوسرا پہلو یہ کہ بعض مہمان مقررین کے خطابات نے سامعین کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں سے بھی صرف ایک پر ہی اس صحبت میں بات ہو رہی ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی کی ذات والا صفات ہمارے قارئین کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ وہ بھارت کے معروف عالم دین ہیں' جامعہ رحیمیہ دہلی کے مہتمم وشیخ التفسیر اور تنظیم اسلامی کے ساتھ عمومی اتفاق اور قلبی لگاؤ کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اپنے سالانہ معمول کے مطابق پاکستان تشریف لائے اور حسن اتفاق سے ان دنوں کراچی میں ہی مقیم تھے۔ انہوں نے صبح کی ایک نشست میں محفل کو رونق بخشی جس کے دوران بعض رفقاء کا یہ تاثر زبانوں پر آیا کہ تنظیم کی عددی قوت میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے اپنی منزل کی طرف کتنا سفر طے کر لیا اور کس قدر ابھی باقی ہے۔ مولانا سے استفادے کے لئے اگلے دن کا تعین پہلے سے تھا جس میں انہوں نے کمال حکمت سے اسی موضوع کو منتخب کیا۔ ان کی سادہ لیکن دل میں اتر جانے والی تقریر نے قلت و کثرت کے وہ پیمانے اور نشانات منزل کو پہچاننے یا شمار کرنے کے وہ معیار دیئے جو معلوم تو سب کو ہیں لیکن ذہن میں مستحضر نہ تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اجتماعیت کی کسی بھی شکل میں شریک افراد کی قلت و کثرت اور اہداف سے قرب یا بُعد کا معاملہ ہمیشہ ہی زیر بحث آتا ہے اور شرکاء کے حوصلے پر اس جائزے کے جو مثبت یا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں' ان کی اہمیت سے انکار بھی ممکن نہیں۔ تاہم اجتماعیت کی نوعیت و ماہیت اس جائزے کے نتیجے کو باہم دگر بالکل مختلف رنگ دیتی ہے۔ اس فانی دنیا سے متعلق محدود مقاصد اور چند روزہ زندگی کے مدار پر محیط طریق ہائے کار اختیار کرنے والی جماعتوں کی کامیابی و ناکامی کے پیمانے بہت تنگ ہیں جبکہ عاقبت کو مطمح نظر بنانے اور منہج نبوی کی اساس پر جمع ہونے والے اس انقلابی گروہ کے لئے فوز و خسران کا مفہوم بہت وسعت رکھتا ہے جو حبل اللہ المتین سے بندھا ہو۔ اور تنظیم اسلامی جیسی انقلابی جماعت کا معاملہ تو اس تناظر میں زیادہ ہی مختلف ہو جاتا ہے جو ایک داعی کی پکار پر جمع ہونے والے افراد پر مشتمل ہے اور جس کے بارے میں اس کے قائد و امیر کا کسی ادعا کے بغیر کہنا محض یہ ہے کہ ایک جماعت بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ الحمدللہ کہ ہمارے رفقاء کے ذہنوں میں اپنی تنظیم کے مقاصد' طریق کار' شرائط شمولیت' عددی قوت اور مختصر تاریخ کے بارے میں مواد کی کمی نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ دم بھر کو من میں ڈوب کر وہ ان میں ربط باہم کا سراغ پا جائیں۔ محترم مولانا اخلاق حسین قاسمی نے ہلکے پھلکے انداز میں جو رہنمائی فرمائی' اس سے سامعین کو دروں بینی میں بڑی مدد ملی۔

ہمیں اللہ والوں کی اس جماعت سے نسبت کا شرف حاصل ہے جس کے امیر محمد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ قدسیوں کے اس گروہ کی ہمسری کا خیال تو ذہن کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا' ہماری حیثیت اس کے لاکھویں درجے میں ہو تب بھی ایک اعزاز ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ تنظیم اسلامی نے اپنے ہدف' طریق تنظیم اور طریقہ کار کو شعوری طور پر اس نہج پر رکھا ہے جو اللہ کے رسولؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ ہم جس راہ کے راہی ہیں اس پر میر کارواںؐ اور قافلہ والوںؓ کے نقوش پا ثبت ہیں۔ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ آج کی دنیا میں اجتماعیت اور جماعت سازی کے رائج و معروف اسلوب ترک کر کے اور ہدایت و رہنمائی کے اصل سرچشمہ کی طرف لوٹ کر ہم نے کتنی بڑی سعادت کمائی ہے۔ یہ منزل بھی قوموں کی زندگی میں بڑی کٹھن ہوتی ہے جسے ہم نے اللہ کی تائید و توفیق سے سر کر لیا۔ پھر اس دور میں منفرد ایک افتخار یہ بھی ہمیں حاصل ہے کہ ہماری دعوت کسی نعرے' کسی منشور اور کسی پروگرام کے گرد نہیں گھومتی' تذکیر بالقرآن پر مشتمل ہے۔ ہم اپنی تنظیم کی طرف رجوع کا آوازہ بعد میں لگاتے اور رجوع الی القرآن کی دعوت پہلے دیتے ہیں۔ منزل ہمارے قدموں سے بہت دور تو ہے لیکن نظروں سے اوجھل نہیں۔ یہ اطمینان ہمیں ضرور میسر ہے کہ اسی راہ پر گامزن ہیں جو منزل مقصود ہی کی طرف جاتی ہے۔

ہمارے بزرگ مولانا قاسمی نے فرمایا کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء اپنی تعداد کی قلت پر کیوں ہراساں ہیں۔ کیا انہیں یاد نہیں کہ بدر کے میدان میں ہمارے آقا و مولاؐ نے تین سو تیرہ افراد کو لا کھڑا کیا اور خود اپنے رب کے حضور سجدے میں گر گئے تھے کہ اے اللہ! یہ میری تیرہ سالہ محنت کی کمائی ہے جو اگر اس معرکہ میں کام آگئی تو روئے ارضی پر تیرا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا۔ اپنے بارہ تیرہ سال کے کام کے ثمرات سے بددلی محسوس کرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ تین سو تیرہ نفوس مطہرہ ہماشما کے نہیں' حضور نبی کریمؐ کے کام کا حاصل تھے جنہیں جنت و دوزخ سامنے پڑی نظر آتی تھی' جن پر قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اور قدم بقدم رہنمائی کے لئے فرشتے آتے تھے۔ مولانا نے ہمیں مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہی کیوں ہوتا ہے کہ اب تک ہم نے حاصل کیا کیا ہے۔ یہ حاصل کیا کم ہے کہ میرے سامنے ڈھائی تین سو اللہ کے بندے بیٹھے ہیں جو ملا مولوی نہیں لیکن چہروں پر مسنون داڑھیوں کی بہار رکھتے ہیں۔ پٹھان' پنجابی' سندھی' بلوچی اور مہاجر ہیں لیکن ایک ہیں۔ بریلوی' دیوبندی اور وہابی ہیں لیکن اپنے آپ کو صرف مسلمان سمجھتے ہیں۔ کاروبار میں' ملازمتوں میں اور بال بچوں میں مصروف رہنے والے ہیں لیکن چھ سات دن نکال کر دور و

نزدیک سے محض دین کے لئے چل کر آئے ہیں۔ اللہ کے ایک بندے ڈاکٹر اسرار احمد کی محنت کا جو مولوی نہیں جدید تعلیم یافتہ ماڈرن آدمی ہے' ثمرہ اس سے بہت کم ہوتا تب بھی بہت تھا کہ ہزار بارہ سو مسلمانوں کو اس نے دین کے لئے جوڑ دیا ہے۔ آپ لوگ بے تاب کیوں ہیں' وہ مرحلہ بھی آکر رہے گا جب آپ کو نقد جاں ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترنا ہو گا' فی الحال تو جمع ہونے اور جُڑنے کو غنیمت جانئے اور تیاری کا حق ادا کیجئے۔ مولانا نے کہا کہ میں علماء کے حلقوں میں جا کر کہا کرتا ہوں کہ اس ماڈرن آدمی سے خوف نہ کھایئے۔ وہ تو آپ کا اکرام کرتا ہے' آپ کے بزرگوں کا خوشہ چیں ہے اور پڑھے لکھے لوگوں کے مجمع میں' خالص مسلم لیگی ذہن رکھنے والوں میں بھی حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا مدنیؒ کی مدح میں رطب اللسان رہتا اور ان سے استفادے پر فخر و انبساط اور ممنونیت کا اظہار کرتا ہے۔

یہ سب باتیں بڑی دل خوش کن تھیں۔ پژمردہ روحوں میں زندگی کی جوت جگانے والی تھیں لیکن ہمارا کوئی ساتھی اگر زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو' ہم چو ما دیگرے نیست کا زعم اگر پیدا ہو گیا ہو تو گھاٹے کا سودا ہے۔ اپنی قلت کو کثرت میں ہمیں بہر حال تبدیل کرنا ہے۔ وقت فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے۔ عشرتِ منزل کو تو حاشیۂ خیال میں بھی لانے کا موقع نہیں آیا۔ ابھی تو تپتی راہیں ہمیں پکار رہی ہیں' گھنیری چھاؤں کو پاؤں نہ پکڑنے دیجئے۔ اور قلت کو کثرت میں بدلنے کی کوشش میں اپنے آپ کو نہ بھول جایئے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک اکائی ہے اور انہیں اکائیوں کے تانے بانے سے ہماری اجتماعیت کا سائبان تیار ہوا ہے۔ اس تانے بانے میں کمزوری ہوئی' ان میں ایک بھی تار عنکبوت ہوا تو اس سائبان میں سے آفات بارش کی طرح ٹپکیں گی' دھوپ کی طرح نہلائیں گی۔ ساتھیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ضرور ڈال کر چلئے لیکن قدم اپنے مضبوط رکھئے تاکہ یمین و یسار جو بھائی آپ کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں انہیں کھڑا رہنے اور چلتے رہنے میں آسانی ہو' سہارا ملے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ہر آن اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ انانیت اور کہیں نہیں صرف یہاں مطلوب و محمود ہے۔ میں اگر مضبوط ہوں تو تنظیم بھی مضبوط ہے۔ میرے فکر میں اگر خامی نہیں تو تنظیم بھی کسی کجی کا شکار نہ ہو گی۔ میرا مقصود رضائے الٰہی ہے تو تنظیم بھی صراط مستقیم پر گامزن رہے گی' دائیں بائیں جھاڑ جھنکار میں الجھ کر نہ رہ جائے گی۔ میں فعال ہوں تو تنظیم بھی سرگرم عمل ہے۔ میں نے اپنی ترجیحات میں دین کی منشاء کے مطابق تقدیم و تاخیر کر لی ہے تو تنظیم کی ترجیحات میں کبھی الجھاؤ پیدا نہ ہو گا۔ میں محنت و ایثار کی روش پر چل نکلا ہوں تو تنظیم میں اسی شعار کو فروغ ہو گا۔ مجھے خود چراغ راہ بننا

ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس فردا کا منتظر نہیں رہنا جب بہت چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔

اجتماعیت کا یہ فائدہ تو ہے کہ افراد ایک دوسرے کی کوتاہیوں کی تلافی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں۔ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ، لیکن سب کی چمک دمک برابر نہیں ہوتی۔ ہاں جتنی کچھ روشنی قلب و ذہن میں پیدا ہو چکی ہو اسے کام میں لانے، پھیلانے اور عام کرنے میں بخل نہیں کیا جانا چاہئے۔ مقدور بھر کرنے سے ہی بات بنے گی۔ اللہ کا دین آج مغلوب ہے، اس کے خالی تالاب کو ہمیں غلبہ کے دودھ سے بھرنا ہے۔ اس امید میں کہ دوسرے تو دودھ ہی لائیں گے، ہم نے پانی کی لٹیا اس میں جا انڈیلی تو وہ آب آب ہو گا۔ دودھ کے رنگ کا شائبہ بھی شاید اس میں موجود نہ ہو۔ ہفتہ بھر گھر بار سے دور رہ کر، سفر کی صعوبت اور اخراجات برداشت کرنے کے بعد اور بہت کچھ کہنے سننے سے اتنی بات ہی ہماری سمجھ میں آگئی ہو تو بہت ہے۔ یہی ہے رخت سفر میرے کارواں کے لئے۔

آیئے مل جل کر اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کریں۔ اس کی طرف سے توفیق کی ارزانی ہو جائے، ہمیں فکر و عمل کی جو راستی میسر ہے وہ میسر رہے اور ہم میں سے ہر شخص جادۂ عزیمت پر چلتے رہنے کی ٹھان لے تو اسی قلت میں کثرت ہے۔ اس اقلیت کا جذب دروں ہی بوقت ضرورت مقناطیس بن کر اکثریت کو کھینچ لے گا۔ ہمیں ہجوم کی اور دھوم دھڑکے کی اس مرحلے میں ضرورت بھی نہیں جو ہماری توجہ کو تقسیم کرنے کا باعث بنے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں جلسہ ہائے عام میں خطاب کرنا صرف دعوت کے لئے ضروری ہے، تنظیم و تربیت کے لئے تو ایک ایک دل کے دروازے پر جا کر دستک دینی ہوگی، دستک بھی دھیمی دھیمی جو کواڑوں کو توڑنے والی نہ ہو، کھلوا کر دم لے۔ ہمارے تخاطب میں وہ سوز و گداز ہو، ایسی ہمدردی ہو کہ دلوں پر جو روح ربانی کے مسکن ہیں، تالے نہ پڑ جائیں۔ کوئی بھی اپنے کواڑوں کو مقفل نہ کرے، اب یہاں روز کوئی درد لئے آئے گا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اور چنیدہ نباتات کے نہایت موثر، کافی وشافی
اجزا حاصل کرنا کمالِ فن ہے، دوا سازی کی عظمت ہے۔ ہمدرد میں ماہرینِ فن
اس عظمت اور خدمت میں ہمہ دم اور ہمہ جہت مصروف ہیں۔

ہمدرد کی فنی محنت اور دوا سازی
کی صلاحیت کا ایک مظہر ہے

جوشینا

نزلہ و زکام ـ جوشینا سے آرام
کھانسی اور سینے کی جکڑن کا موثر علاج

خدمتِ خلق روحِ اخلاق ہے

تذکرہ وتبصرہ

تصویر کے دو رُخ

جمہوریت کی بحالی باعثِ مسرت لیکن ایک اسلامی ملک میں خاتون کا سربراہ بننا مقامِ افسوس ہے

ذیل میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دو خطابات جمعہ کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے ۔ ۲ر دسمبر کے فکر انگیز خطاب میں محترم ڈاکٹر صاحب نے محترمہ بے نظیر کے وزیر اعظم نامزد کیے جانے پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور گویا اس طرح باشعور دینی حلقوں کے جذبات و احساسات کو زبان کا لبادہ پہنایا ہے۔ ۹ر دسمبر کا خطاب موجودہ سیاسی حالات کے تناظر میں مذہبی اور دینی جماعتوں کی خدمت میں اُن گزارشات اور مشوروں پر مشتمل ہے جن کا ذکر اس سے قبل منتشر انداز میں مختلف تقاریر میں آچکا ہے تاہم اِس خطاب میں اُن سب کو جامع اور مربوط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ دونوں خطابات ہفت روزہ 'ندا' کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔

(ادارہ)

حمد وثنا کے بعد!.....

"جیسی عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی کے مثل ان کے حقوق بھی ہیں دستور کے موافق' اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے اور اللہ سب پر غالب ہے' حکمت والا" (سورۃ البقرہ آیت ۲۲۸) "اور مت تمنا کرو اس معاملے میں جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو (خیر و شر) وہ کماتے ہیں اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو (نیکی یا بدی) وہ کماتی ہیں..... مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے" ۔ (سورۃ النساء آیات ۳۲ اور ۳۴) "کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے' ہنستے مسکراتے' بشارتیں حاصل کرتے اور کتنے ہی چہرے اس روز غبار آلود ہوں گے' ان پر چھائی ہوگی سیاہی (سورۃ عبس آیات ۳۸ تا ۴۱) ۔

حضرات! آج میں اپنی گفتگو کا آغاز سورۂ عبس کی آیات کے حوالے سے کر رہا ہوں اس لئے کہ اس میں میدان حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے

ہوں گے تو ان کی کیفیات بڑی متضاد ہوں گی۔ الفاظ مبارک یہ ہیں "وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○ " بہت سے چہرے اس دن روشن اور تابناک ہوں گے اور ہنس رہے ہوں گے یا یوں کہئے کہ تبسم ہو گا ان کے چہروں پر جیسے انہیں کوئی بہت بڑی خوشخبری ملنے والی ہے۔ اس کے برعکس "وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ" بہت سے چہرے اس دن ایسے غبار آلود ہوں گے جیسے دھواں سا آ گیا ہو۔ "تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ" مایوسی کی سیاہی ان پر چھائی ہوئی ہو گی۔ یہ ہے قیامت کا نقشہ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس بڑی قیامت سے پہلے دنیا میں بھی کچھ چھوٹی بڑی قیامتیں آتی ہیں مثلاً ایک قیامت وہ ہے جس کی طرف حضورؐ نے اشارہ فرمایا کہ "جس شخص کا انتقال ہو گیا اس کی قیامت تو واقع ہو گئی"۔ اس لئے کہ جو مہلت عمل تھی وہ ختم ہوئی اب نتیجے کا اعلان یوم قیامت کو ہو جائے گا۔ اسی طرح ہائی سکول کے طلبہ کا ہی وہ نقشہ ذہن میں لائیے جب وہ رزلٹ سننے کے لئے سکول کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ عام طور پر وہ طلبہ جنہیں اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے بڑے خوش و خرم نظر آتے ہیں اور وہ جنہوں نے پورا سال پڑھائی کی جانب کوئی توجہ ہی نہیں دی' ناکامی ان کے چہروں پر لکھی نظر آتی ہے۔

ملک میں آج وہی نقشہ ہے

آپ میں سے سب کا احساس ہو گا اور مجھے بھی شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے کہ آج ہماری قوم واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کے ہاں خوشیوں کے شادیانے بج رہے ہوں گے' جشن کی تیاریاں ہوں گی اور نجانے ابھی اس جشن کے سلسلے میں

> ایک تضاد جب تک بہت نمایاں نہ ہو' بہت کم لوگ اسے پہچان کر اس کا ادراک و شعور حاصل کر سکتے ہیں۔

اور کیا ہو گا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں کہ جن کے چہرے پر افسردگی ہے' مردنی چھائی ہوئی ہے اور مایوسی کی سی کیفیت ہے۔ یہ دو بالکل متضاد کیفیات آج ہمارے ملک میں بہت نمایاں ہیں۔ اللہ کرے کہ اس معاملے میں جذبات بے قابو نہ ہوں جشن منانے والے بھی حدود سے تجاوز نہ کریں' دوسروں کے جذبات کا لحاظ کریں اور جو افسردگی کا شکار ہیں' ان کی مایوسی بھی

اس درجے کو نہ پہنچ جائے کہ جذباتی طرز عمل اختیار کر لیں۔ اس لئے کہ یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہے اور قومی سطح پر سیاسی جماعتوں کا ایک اور امتحان ہے جس سے چند دنوں میں قوم کو گذرنا ہے۔ ہم مشورہ دے سکتے ہیں اور دعا کر سکتے ہیں کہ جیسے پچھلے مراحل سے ملک و قوم کو اللہ تعالیٰ نے بحیثیت مجموعی بخیر و عافیت گذار دیا ہے۔ ویسے ہی اس مرحلے پر بھی لوگوں کو ہمت دے کہ اپنے

> دین کے اعتبار سے بنگلے اور محل میں رہنے والوں کا حال کٹیا میں بسنے والوں اور فٹ پاتھ پر سونے والوں سے مختلف نہیں۔

جذبات کو قابو میں رکھیں اور ان لوگوں کو مزید رنج پہچانے والے انداز اختیار نہ کریں جو ناکام ہوئے ہیں۔ جو لوگ ناکام ہوئے وہ بھی یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ جمہوریت کی گاڑی پٹڑی پر چلے گی تو یہ مراحل بار بار آئیں گے۔ یہ کوئی آخری شکست اور آخری فیصلہ نہیں ہے۔ میرا تو اندازہ ہے کہ بمشکل ڈیڑھ دو سال کے اندر دوسرا الیکشن اس ملک میں ہو کر رہے گا اور اسی وقت ایک پائیدار نتیجہ بر آمد ہو گا۔ ملک میں گیارہ برس تک سیاسی گھٹن رہنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا ہے تو اس کے نتائج غیر معمولی ہیں اور ان میں ردعمل کو بہت دخل حاصل ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیں اور آئندہ کے لئے ہمت کریں۔ اپنے اپنے نظریات اور اپنے اپنے پروگرام سامنے لائیں' اپنی اپنی جماعتوں کو منظم کریں اور ان میں کاڈر معین کریں۔ انشاءاللہ تعالیٰ یہ گاڑی آگے چلے گی تو اس میں سے خیر بر آمد ہو گا۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ وہ ہار جیت تو بس ایک ہے جس کے بعد کوئی ہار اور جیت نہیں اور وہ قیامت کے دن کی ہار جیت ہے' ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ جو اس روز جیتا' وہ جیتا جو ہارا' وہ ہارا۔ دنیا میں تو یہ معاملات چلتے رہتے ہیں ہماری کرکٹ ٹیم پے بہ پے شکستیں کھانے کے بعد بھی ہمت نہیں چھوڑتی' از سرنو کوشش شروع کر دیتی ہے۔ ہاکی میں ہم اپنا اعزاز عالمی سطح پر کس بری طرح کھو بیٹھے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کھیل کو چھوڑ ہی دیا جائے۔ سیاست کے معاملے میں بھی وہی سپورٹس مین سپرٹ سیاسی کارکنوں کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے۔ بہرحال تابناک اور بجھے چہروں کی یہ جو تقسیم آج کے دن ہمارے ملک میں نمایاں ہے اس کی سب سے منفرد مثال سندھ کی ہے۔ اندرون سندھ پیپلز پارٹی کو جو فتح حاصل ہوئی ہے اس کی مثال ۷۰ء میں عوامی لیگ کی فتح تھی بلکہ وہ بھی نہیں بنتی۔ اس لئے کہ وہاں بھی کچھ لوگوں نے بڑا مقابلہ کیا تھا جبکہ سندھ میں تو مقابلہ رہا ہی نہیں۔ اسی طرح کراچی میں ایم کیو ایم نے جس طرح کی فتح

حاصل کی ہے اس کی بھی ہمارے ملک کی تاریخ میں کوئی مثال موجود نہیں۔ چنانچہ سندھ میں اترے ہوئے چہرے کم ہیں اور تروتازہ زیادہ۔ پنجاب اور سرحد میں اس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں دونوں گروہ برابر کی چوٹ ہیں۔ پنجاب میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو فتح حاصل ہوئی تو صوبائی انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد بازی لے گیا اور کچھ ایسا ہی معاملہ سرحد کا بھی ہے۔ بلوچستان کی حد تک کوئی صورتحال واضح نہیں ہے۔

مسرت اور غم کا امتزاج

اب اس پس منظر میں عرض کر رہا ہوں کہ ایک کیفیت میری ہے جو ان دونوں سے بالکل مختلف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی اسی کیفیت میں ہیں۔ اگرچہ ملک کی آبادی کے اعتبار سے انہیں MICROSCOPIC MINORITY خوردبینی اقلیت ہی کہا جا سکتا ہے۔ میرا' میرے ساتھیوں اور ہم خیال لوگوں کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل منفرد اور ان دونوں گروہوں سے بالکل مختلف ہے کہ ایک پہلو سے ہمیں خوشی ہوتی ہے اور ایک امید افزا صورتحال' مایوسی کے اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن نظر آ رہی ہے تو دوسرے پہلو سے شدید رنج و غم ہے اور سخت فکرمندی اور صدمے کی کیفیت۔ میرے یہ چند دن اسی کیفیت میں گذرے اور خاص طور پر آج کی رات میں نے بڑے کرب میں گذاری ہے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ آج جب یہاں حاضری ہوگی تو کس طرح میں اپنے خیالات کو مجتمع کر سکوں گا اور کیسے اپنے صحیح احساسات بیان کر سکوں گا۔ جب میں یہ سوچ رہا تھا تو بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں کی ایک روایتی بڑھیا یاد آئی جس کے بارے میں آیا کہ ایک طرف دیکھتی تو ہنستی تھی اور دوسری طرف دیکھتی تو روتی تھی۔ بالکل اسی طرح کی کیفیت میری ہے کہ اس وقت دو بالکل متضاد چیزیں میرے سامنے ہیں۔ ایک کے اعتبار سے امید افزا صورتحال ہے تو دوسرے کے اعتبار سے بڑا مایوس کن نقشہ سامنے آیا ہے اور جب میں نے غور کیا تو یاد آیا کہ پہلے بھی میں اپنی تقریروں میں ایک الجھن (DILEMMA) کا تذکرہ کرتا رہا ہوں۔ آج وہ الجھن اور تضاد ہماری قومی اور ملی زندگی میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ ایک تضاد جب تک بہت نمایاں نہ ہو بہت کم لوگ اسے پہچان کر اس کا ادراک و شعور حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب وہ بہت نمایاں ہو جاتا ہے تو پھر اندھے کو بھی نظر آ جاتا ہے کہ یہ صورتحال ہے۔ آج مجھے یاد آیا کہ ۱۶ر اکتوبر ۷۱ء کو یعنی مشرقی پاکستان کے سقوط سے دو مہینے پہلے کی فضا میں بھی میرا احساس بہت شدید

تھا اور میں نے اس روز ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن لاہور کے ایک اجلاس میں جہاں مجھے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا کہ ملک وملت کے اہم مسائل کے موضوع پر جو اس وقت موجود ہیں ہم سے خطاب کرو' تو میں نے جو تقریر کی اور وہ "میثاق" کے شمارہ نومبر ۷۱ء میں شائع ہوئی۔ اس تقریر میں' میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس وقت پاکستان عدم استحکام سے دوچار ہے۔ بلکہ میں اس زمانے میں یہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان روئے ارضی پر غالباً واحد ملک ہے کہ جس میں ذرا آندھی بھی چلتی ہے تو لوگوں کو خطرہ ہونے لگتا ہے کہ ملک رہے گا یا نہیں رہے گا کہیں اور اپوزیشن لیڈر برملا یہ نہیں کہتے کہ ہم اس ملک کو توڑ دیں گے۔ اس وقت تک اگرچہ جی ایم سید صاحب اتنے واضح الفاظ کے ساتھ سامنے نہیں آئے تھے لیکن ولی خان صاحب کے الفاظ یاد ہوں گے کہ یہ زنجیر جو طور خم پر لگی ہوئی ہے' ہم لاکر مارگلہ پر لگا دیں گے۔ گویا برملا وہ اعلان کر رہے تھے کہ سرحد کا ہی نہیں پنجاب کا بھی خاصا بڑا شمالی حصہ ہم کاٹ کر لے جائیں گے' پاکستان سے علیحدہ ہو جائیں گے دنیا میں کون ملک ایسا ہو گا جہاں ایک اہم اپوزیشن لیڈر اس حد تک جاتا ہو

اصل عقدہ کیا ہے

اپنی اس تقریر میں' میں نے تجزیہ کیا تھا کہ اس صورتحال کا سبب کیا ہے اور DILEMMA کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے قومی وجود کا یہ عقدہ لاینحل ہے اور اس کے ساتھ ایک لفظ اور آتا ہے HORNS OF DILEMMA یعنی ایک طرف ایک انتہائی بات ہے اور دوسری طرف دوسری انتہائی بات۔ ان دونوں کے درمیان ایک مخمصہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایک طرف ہم نے ایک ملک پاکستان بنایا ہے جس کے لئے واحد وجہ جواز صرف اور صرف اسلام ہے' جس کے علاوہ کوئی JUSTIFICATION ہی نہیں۔ یہ ملک ہر اعتبار سے ایک مصنوعی ملک تھا۔ برعظیم پاک و ہند کے درمیان کوئی فطری لکیر نہیں تھی۔ پنجاب کے میدان کیک کی طرح کاٹے گئے حتیٰ کہ اس کے دریا بھی کاٹ دیئے گئے یا تقسیم کر دیئے گئے۔ ہم نے یہاں کے طبعی جغرافیہ کے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔ اتنی بڑی بڑی لنک کینالز (LINK CANALS) یوں بنانی پڑیں' جو مصنوعی دریا ہیں اس لئے کہ تقسیم بالکل غیر طبعی اور مصنوعی تھی جس میں جغرافیہ کا کوئی لحاظ ہی نہیں رکھا گیا۔ تو یہ جو تقسیم ہوئی ہے' درحقیقت اس کا جواز صرف اور صرف اسلام ہے اور اس کے استحکام کے لئے کوئی بنیاد نہیں

سوائے اسلام کے۔ اس کی یکجہتی کے لئے کوئی فارمولا نہیں سوائے اسلام کے اور بعد میں میں نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں اپنے اس خیال کو بڑی تفصیل سے اور دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کیا ہے کہ کوئی نیشنلزم ہمارے ہاں ممکن نہیں ہے۔ نہ کوئی نسلی قومیت ہے' نہ لسانی قومیت اور نہ علاقائی قومیت۔ بلکہ وطنی قومیت کی تو کلی طور پر نفی کر کے پاکستان بنایا گیا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہماری قومیت کی بنیاد تو مذہب ہے ہم وطن کی بنیاد پر قومیت کے قائل نہیں۔

سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربیؐ است

جس ملک کی بنیاد ہی وطنی قومیت کی نفی پر رکھی گئی ہو' اس کے لئے وطنی قومیت استحکام کی بنیاد کیسے بن جائے گی۔ بہرحال میں نے عرض یہ کیا تھا کہ ایک عقدہ درپیش ہے۔ کہ ایک طرف ایک ایسا ملک ہے جس کے لئے کوئی بنیاد سوائے اسلام کے کوئی اور نہیں اور دوسری طرف اسلام ہی وہ شے ہے جو یہاں نہیں ہے۔ نہ دیکھنے میں ہے' نہ کہنے میں۔ اور رسموں کے سوا اور کسی شے میں اسلام نہیں ہے۔

معاشرے کی حقیقی صورتِ حال

میں حیران ہوتا ہوں کہ میرا اس وقت کا احساس کتنا شدید تھا جس کے تحت میں نے ایک تجزیہ دیا جو اب میری کتاب "استحکام پاکستان" میں شامل ہے کہ اگر میں اس معاشرے کو دیکھتا ہوں تو دین و مذہب کے اعتبار سے مجھے یوں نظر آتا ہے کہ چار ہم مرکز دائرے (CONCENTRIC CIRCLES) ہیں' ایک چھوٹا سا دائرہ' پھر ذرا بڑا دائرہ' پھر اس سے بڑا دائرہ اور آخر میں سب سے بڑا دائرہ جو پورے معاشرے پر محیط ہے۔ بیرونی بڑے دائرے میں ہماری آبادی کا ۸۵ سے لے کر ۹۰ فیصد تک آجاتا ہے جس کا کوئی تعلق سرے سے دین و مذہب کے ساتھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ نام مسلمانوں کے سے ہیں' مردے وہ دفنائیں گے اور شادی ہوگی تو مولوی آکر نکاح پڑھائے گا۔ باقی اور کوئی سروکار انہیں دین سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر پیمانہ وہ لیا جائے جو محمد عربیؐ نے عطا فرمایا۔ تو الفرق بین الاسلام و الکفر الصلوۃ۔ (اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل نماز ہے) اور یہ نہیں کہ سال میں ایک بار پڑھ لی یا جمعہ کے جمعہ پڑھ لی تو وہ حد فاصل ہو جائے گی۔ مراد نماز

پنجگانہ ہے جس کی پابندی نہ ہو تو نماز نہیں۔ اس پیمانے سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کے ۸۵ سے ۹۰ فیصد میں اسلام نہیں ہے سوائے ایک نسلی' ایک روایتی اور ایک نام کے مذہب کے۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ اس اعتبار سے بنگلے اور محل میں رہنے والوں کا حال کٹیا میں بسنے والوں اور فٹ پاتھ پر سونے والوں سے مختلف نہیں۔ کارخانہ دار اور مزدور' زمیندار اور کاشتکار سب یکساں ہیں۔ ہماری عظیم اکثریت کا نماز سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے اندر کے دائرے میں ایک دوسرا حلقہ ہے جس کا مذہب سے کچھ لگاؤ ہے۔ کچھ نہ کچھ نماز روزہ' مسجد سے کچھ تعلق اور یہ کل دس پندرہ فیصد بنے گا۔ لیکن اس کی غالب اکثریت کا تصور مذہب محدود (LIMITED) بھی ہے اور مسخ شدہ (PERVERTED) بھی۔ اس لئے کہ آپ کو یہاں حال وہ ملے گا کہ ایک طرف عمرے ہو رہے ہیں اور سال بہ سال حج ہو رہے ہیں تو دوسری طرف بلیک مارکیٹنگ ہے' سودی کاروبار ہے' ڈٹ کے سٹہ کھیلا جا رہا ہے۔ مسجدوں کی سرپرستی ہے' عالیشان مسجدیں تعمیر کی جا رہی ہیں اور فرشی (WALL TO WALL) کارپٹ بچھائے جاتے ہیں اور بہترین فانوس لٹکا دیئے گئے ہیں لیکن اکثر و بیشتر لوگ جو اس نیک کام میں آگے آگے ہیں' ان کے کاروبار سارے کے سارے حرام پر چل رہے ہیں۔ در حقیقت یہی وہ تصور مذہب ہے جو نوجوان نسل کو اپنے دین سے برگشتہ کر رہا ہے۔ تیسرا طبقہ اس کے اندرونی چھوٹے دائرے میں ہے اور پانچ سات فیصد سے زیادہ نہیں۔ ان کا تصور دین کافی وسیع ہے' علامہ اقبالؒ کی شاعری' مولانا مودودی کی کتابیں اور دیگر اہل قلم کی تصانیف انہوں نے پڑھی ہیں۔ اس سے تصور تو مل گیا کہ دین مکمل نظام زندگی ہے' غلبہ چاہتا ہے اور ہمیں اس کا پورا نظام قائم کرنا چاہئے۔ لیکن ان لوگوں کی اکثریت بھی یوں سمجھئے کہ ان پانچ سات فیصد میں سے نصف بلکہ زائد' خود کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر دین کا مرثیہ کہتے رہیں گے' افسوس کرتے رہیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے' لیکن ان کی صبح و شام کے انداز نہیں بدلتے۔ کئی کئی کورسز کا ڈنر کھانے کے بعد جب گفتگو ہو گی تو اسلام کے لئے بڑا درد ہو گا اور بڑی خواہش ہو گی کہ اسلام آنا چاہئے' اس کے لئے ہمیں کام کرنا چاہئے' یہ کیا ہو گیا اس نے کیا کہہ دیا اور اس نے کیا کر دیا لیکن یہ کہ اس کے لئے نہ خود کو بدلنے کو تیار' نہ قربانی دینے کو تیار۔ ان میں کل تین چار فیصد ہماری آبادی ایسی ہے جسے فعال (ACTIVISTS) کہا جا سکتا ہے' جو کام کرتی ہے اور کسی نہ کسی تحریک سے وابستہ ہے جو کام کرتے ہیں بھاگ دوڑ کرتے ہیں' لیکن ان لوگوں کا بھی المیہ یہ ہے کہ ایک

دوسرے سے دست و گریباں ہیں لہٰذا غیر مؤثر ہو کر رہ گئے ہیں۔
یہ ہے اسلام کے نقطہ نگاہ سے عملاً ہمارے معاشرے کا حال۔ میرا یہ تجزیہ ۱۹۷۱ء کا ہے لیکن سترہ برس میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئی۔

ہماری خوش فہمی ہی بدبختی ہے

اہل پاکستان کے دینی، ملکی اور قومی فرائض کے ضمن میں بھی میں نے بارہا ایک تجزیہ کیا ہے اور آج پھر عرض کر رہا ہوں کہ ہر انسان پر بہت سے فرائض کا بوجھ ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ ایک بوجھ تو وہ ہے جس کے لئے جذبہ اس کے اندر سے ابھرتا ہے لہٰذا وہ بوجھ بھی اٹھاتا ہے، مشقت بھی کرتا ہے اور اس کا کسی پر احسان بھی نہیں دھرسکتا۔ اس کے لئے نہ کوئی ترغیب ضروری، نہ کوئی وعظ کہنے کی ضرورت۔ اندر سے پیٹ کھ مانگتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کام کرتا ہے کہ اپنے پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اسی طرح ہر شخص کو کوئی نہ کوئی جھونپڑا، کوئی چھت اپنے سر پر چاہئے لہٰذا ہر شخص گھر بنائے گا۔ چاہے جھونپڑا بنائے یا کوئی کٹیا یا محل، بنائے گا ضرور۔ کبھی آپ نے یہ وعظ نہیں سنا ہوگا کہ مکان ضرور بناؤ۔ ایک ذاتی تقاضے کے طور پر شادی بھی ہر شخص کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک جنسی جذبہ ہے اس کے لئے بھی وعظ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شادی کر کے ہر شخص کئی کئی پیٹوں پر مشتمل کنبے کی کفالت کرتا ہے اور ہماری محنت کا ۹۰ فیصد حصہ اسی کام میں لگا ہوا ہے۔ البتہ ان تین ذاتی تقاضوں کے ساتھ تین فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق شعور اور فکر سے ہے۔ لہٰذا ان کے لئے یاد دلانے کی اور وعظ و نصیحت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ تین کیا ہیں؟ پہلا یہ کہ جس ملک میں

انسان رہتا ہو اس کی عزت و آزادی کے بقاء اور تحفظ کے لئے ایثار اور قربانی کرے۔ دوسرے یہ کہ جس قوم سے اس کا تعلق ہے اس قوم کے لئے بھی اپنی محنتوں اور صلاحیتوں کا کچھ حصہ وقف کرے جو اگر نہیں کرے گا تو قوم ذلیل و رسوا ہو جائے گی۔ تیسرا یہ کہ جس دین اور مذہب کا نام لیتا ہے، اس کے لئے دل میں خواہش رکھے کہ سربلند ہو اور اس کا بول بالا ہو اور یہ

تب ہی ممکن ہے جب اس کے لئے محنت و مشقت کی جائے۔ وقت' صلاحیت اور توانائی اس پر لگائی جائے۔

ہمارے دین کو شان نصیب ہوئی تھی تو اس لئے کہ صحابہ کرامؓ نے اپنا تن من دھن لگا دیا۔ ایسے ہی تو نہیں ہو گئی۔ اللہ ہی کو اگر کر دینا ہوتا تو آج بھی کر دیتا۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں بھی کر سکتا تھا آن واحد میں' لیکن یہ تو لوگوں کی ذمہ داری ہے' وہ دین کے لئے قربانیاں دیں' محنتیں کریں' جدوجہد کریں تو دین سربلند ہو گا اور اگر وہ دین کو پیٹھ دکھا دیں' لگ جائیں اپنے نفس کے تین تقاضوں کے پیچھے تو قوم بھی ذلیل ہو گی' وطن بھی رسوا ہو گا اور دین بھی پامال ہو جائے گا۔

یہی وہ اصل بات ہے جس کے لئے مجھے اتنی تمہید باندھنی پڑی کہ ہم مسلمانان پاکستان اس آسمان تلے اور زمین کے اوپر کی خوش قسمت ترین قوم تھے کیونکہ ہمارے یہ تینوں غیر نفسانی تقاضے ایک وحدت بن گئے تھے۔ ہمارا ملک بھی وہ جو ابن اسلام ہے جیسے حضرت سلمان فارسیؓ فرمایا کرتے تھے یہ ملک اس نعرے پر وجود میں آیا کہ پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ۔ پھر ہماری قومیت بھی اسلام۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وطن کے اعتبار سے ہم پاکستانی ہیں تو قومیت کے اعتبار سے اس ملت اسلامیہ کا حصہ ہیں کہ جو مشرق اقصیٰ سے مغرب بعید تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور تیسری آخری بات یہ کہ ہمارا دین بھی اسلام ہے۔ اب ہم تین شکار ایک تیر سے کر سکتے تھے یعنی ایک تیر سے دو شکار والے محاورے سے بھی ہمارا معاملہ بہتر تھا۔ اگر دین کو مستحکم کر لیتے تو ملک بھی مستحکم اور قوم بھی مستحکم۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لئے کسی ہندوستانی مسلمان کا تصور کیجئے۔ ملک اس کا بھارت ہے۔ وطن کا تقاضا ہے بھارت کے ساتھ وفاداری اور اس کی بہتری کے لئے سوچنا' لیکن دل اس کا پاکستان کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ یہ تضاد اور داخلی جذبوں کا تصادم اس کی شخصیت کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہو رہی ہو تو حب وطن کا تقاضا ہے کہ جس ملک میں اس کا گھروندا اور چھوٹا موٹا کاروبار ہے' اس کی خیر ہو لیکن اس کا دل پاکستان کی فتح کی دعا مانگتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھئے کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ ہمارے وطن کا تقاضا' ہماری قومیت کا تقاضا اور ہمارے دین کا تقاضا ایک وحدت ہے۔ لیکن میں کہا کرتا تھا کہ ہم نے اپنی اسی انتہائی خوش قسمتی کو اپنی سب سے بڑی بدقسمتی بنا لیا ہے۔ دین کو ہم نے مستحکم نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا وطن بھی دو ٹکڑے ہوا اور دو ٹکڑے سے آگے ہو کر کئی ٹکڑے ہونے والا تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے بہتری کی شکل پیدا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے

بہتری کی امید ہے ورنہ حالات جس رخ پر جارہے تھے اس میں ہماری تباہی کے پوری دنیا کے اندر چرچے تھے۔ بین الاقوامی سطح کے تجزیہ نگاروں نے کہا کہ چالیس سال گذرنے کے بعد بھی پاکستان اپنے تشخص کی تلاش میں ہے۔ کراچی سمیت سندھ کی نوجوان نسل تو اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ اس نے پاکستان کو اور اس کے جذباتی عنصر نے اسلام سے بھی رشتہ منقطع کر لیا۔ یہ

اسلام جو عائلی اور معاشرتی نظام دیتا ہے اس میں عورت کا یہ مقام نہیں کہ کسی مسلمان ملک کی سربراہ ہو۔

صورتحال کیوں ہوئی؟۔ اس لئے کہ اسلام کو ہم نے مستحکم نہیں کیا بلکہ کمزور کیا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ہمارے لئے کوئی وطنیت رہی' نہ قومیت۔ یاد رکھئے کہ کوئی قومیت ایسی نہیں جو پاکستان کو متحد رکھ سکے کیونکہ اب قومیتیں وہ ہیں جو پاکستان کو توڑنے پھوڑنے والی ہیں' ایک اور متحد رکھنے والی نہیں۔ بنگلہ دیش تو بن ہی گیا اور سندھو دیش کے لئے حالات بالکل تیار ہو چکے تھے۔

عورت کی سربراہی

آج اس تضاد کی دونوں انتہاؤں کا جو بھرپور مظاہرہ سامنے آیا ہے۔ اسے اسی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ شاید قبل ازیں اس قدر نمایاں نہیں ہوا تھا آخر کیوں؟ ایک طرف دین میں عورت کا جو مقام ہے اسے کون شخص نہیں جانتا۔ اس پر فنی بحث ہو سکتی ہے کہ حرام مطلق ہے یا نہیں اور کم از کم میں نے یہ لفظ اپنی پندرہ دن پہلے کی تقریر میں استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ یہ یقیناً اسلام کے مزاج کے منافی اور دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام جو عائلی اور معاشرتی نظام دیتا ہے اس میں عورت کا یہ مقام نہیں کہ کسی مسلمان ملک کی سربراہ ہو اور حکومت کی سربراہ بن جائے۔ اور یہ بات اتنی نمایاں ہے کہ آج دینی حلقے چونک گئے ہیں۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کا یہی ملک تھا جس کی قسمت میں یہ ہونا لکھا تھا۔ میں نے بعض دوسرے علماء سے بھی گفتگو کی' معلوم ہوا وہ بھی اس رائے کے ہیں کہ حرام مطلق نہیں ہے البتہ مکروہ ہے۔ مکروہ اس چیز کو کہتے ہیں جو دین میں ناپسند ہو' جو دین کے مزاج کے منافی ہو لیکن اس کی حرمت پر کوئی نص قطعی موجود نہ ہو تاہم یہ مکروہ تحریمی ہے یعنی شدید ناپسندیدہ۔ یہ درست ہے کہ رضیہ سلطانہ اس ملک پر حکمران رہی ہے اور یہ خاندان غلامان کا وہ دور تھا جس سے بہتر دور کبھی بھی اسلام کا اس برعظیم پاک و ہند میں نہیں آیا تھا۔ وہ التمش کی

بیٹی تھی جو خلیفہ مجاز رہے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسے ولی اللہ کے۔ التمش کا کہنا تھا کہ میرے بیس بیٹے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایسا لائق نہیں کہ حکومت کی ذمہ داری سنبھال سکے سوائے میری اس بیٹی رضیہ کے۔ لیکن بہرحال شریعت کا معاملہ اپنی جگہ رہے گا اور تاریخی شواہد اپنی جگہ۔ اسی دور میں مصر میں ممالیک کی حکومت تھی۔ ممالیک بھی غلاموں کو کہتے ہیں۔ عالم اسلام کا یہ عجیب دور تھا کہ مسلمانوں کی دو بہترین حکومتیں ہندوستان اور مصر میں غلاموں کے ہاتھ میں تھیں اور ان کا بھی سب سے شاندار زمانہ دو خواتین کی سربراہی میں رہا۔ تاہم عورت کی سربراہی مکروہ تحریمی بہرحال ہے۔ میں نے پندرہ دن پہلے کہا تھا کہ اللہ مجھ پر میری زندگی میں وہ دن نہ لائے کہ میں دین کے کسی منکر کو معروف قرار دوں۔ غلطی مجھ سے بھی ہو سکتی ہے لیکن جو بات میں نے سمجھی ہے اس کے بیان کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ میں نے مرحوم ضیاء الحق کے سامنے کھڑے ہو کر بات کی ہے اور اس دور میں جب میرے دل میں مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی انتہائی عقیدت تھی' جماعت کے سالانہ اجتماع میں انہیں FACE کیا' ان سے اختلاف کیا جبکہ میری عمر بمشکل پچیس برس تھی۔ مجھے اس کے منکر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ میں نے تقریریں کی ہیں اور اس موضوع پر میری کتاب "اسلام میں عورت کا مقام" موجود ہے۔ وہی آیات جن کا میں نے آج حوالہ دیا ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ یعنی جیسے ان کے فرائض ہیں ویسے ہی ان کے حقوق ہیں۔ اور یہی دنیا کا معروف اصول ہے۔ جہاں آپ نے ذمہ داری کا بوجھ زیادہ ڈالا ہو' وہیں اختیارات بھی زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ اور "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ○ سے ظاہر ہو گیا کہ مردوں کو ایک درجہ فوقیت کا ان پر حاصل ہے تو قرآن کے یہ الفاظ کہاں لے جائیں گے۔ تاویلات اپنی جگہ' لیکن قرآن کے الفاظ تو یہی ہیں اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے اس نے جو نظام بنایا ہے اختیار مطلق سے بنایا کہ جو چاہے حکم دے تاہم اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ آگے سورۂ نساء میں فرمایا وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (اور نہ تمنا کیا کرو ان چیزوں کی جن میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی) کسی کو خوبصورت بنایا کسی کو بدصورت۔ اب وہ بدصورت اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہے تو کسی کا کیا بگاڑ لے گا' اپنی ہی شخصیت کو مسخ کرے گا۔ کسی کو مرد بنایا کسی کو عورت' عورت ساری عمر اسی میں پیچ و تاب کھاتی رہے کہ مجھے مرد کیوں نہیں بنایا اس سے کیا حاصل۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا

اکْتَسَبُوْا (دیکھو مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے کمایا) وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (اور عورتوں کے لئے اس میں سے جو انہوں نے کمایا) کمائی سے مراد کیا ہے؟ نیکی اور بدی کے یہ میدان کھلے ہوئے ہیں۔ عورت اگر کسی درجے میں کم تر رہ گئی ہے تو نیکی کا میدان کھلا ہوا ہے' وہ لاکھوں کروڑوں مردوں سے آگے نکل سکتی ہے۔ کیا رابعہ بصریؒ آگے نہیں نکل گئیں؟ کیا حضرت مریمؑ آگے نہیں نکل گئیں؟۔ کیا حضرت خدیجہؓ سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں سے اوپر نہیں چلی گئیں؟۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی مثالیں بھی سامنے ہیں اور پھر آخری آیت سورۃ نساء کی اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ اللہ نے مردوں کو قوام بنایا ہے عورتوں پر' وہ حکمران ہیں' ان کے ذمے ہے، نگرانی و نگہبانی اور عورتوں کے لئے صحیح روش کیا ہے "بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" میں اشارہ کر دیا ہے۔ اللہ نے فضیلت دی ہے بعض کو بعض پر۔ پہلے اسی کے لئے تمہید تیار کی گئی تھی کہ اللہ نے جو فضیلت دی بعض کو بعض پر' اس پر تلملانا نہیں چاہئے' پیچ و تاب نہیں کھانا چاہئے۔ یہ اللہ کی حکمت ہے۔ اب یہاں پر بات صاف کر دی کہ اللہ نے مردوں کو ایک فضیلت دی عورت پر "لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مردوں کو قوام بنایا ہے خرچ کرنے کا معاملہ ان ہی کے ذمے لگایا ہے یہ دوسرا پہلو تو عائلی زندگی سے متعلق ہو گیا۔ لیکن پہلا اصول عام ہے "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ" اور یقیناً اس میں قوم و ملک کی سربراہی بھی شامل ہے۔ تو میرے سامنے یہ محکمات قرآن مجید کی نصوص ہیں۔ ایک طرف یہ نقشہ سامنے آ رہا ہے لیکن دوسری طرف جمہوریت کا تقاضا ہے کہ اس خاتون کو قوم نے منتخب کیا ہے۔

تضاد صرف نمایاں ہوا ہے

غلام اسحاق خان صاحب نے رات جو بات کہی صد فیصد درست کہی ہے۔ یہ خاتون کہیں آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑی' اس قوم کے لاکھوں افراد نے ان کو ووٹ دیا ہے۔ کل میں نے ایک صاحب سے ملاقات کی جو ابھی سعودی عرب سے آئے ہیں انہوں نے ایک ایسا جملہ کہا جو جا کر سیدھا دل پر تیر کی طرح لگا ہے۔ وہاں لوگ کہہ رہے تھے "عندکم ما فی الرجال" (اے پاکستانی قوم کیا تمہارے پاس مرد نہیں رہے) یہ دوسری بات ہے کہ ان

کے ہاں کیا نظام ہے' اس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے کیونکہ وہ طرز حکومت نہایت استبدادی نظام ہے' اس میں عوام کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ لیکن جو طعنہ انہوں نے ہمیں دیا وہ تو اپنی جگہ صحیح ہے۔ کیا یہاں کوئی مرد ایسا نہیں ہے جس پر قوم اعتماد کرتی' جو قوم کا اعتماد حاصل کرتا۔ جس کو یہاں پر ووٹ ملتے جو میدان میں آتا اور اپنی حیثیت منواتا۔ معلوم ہوا کہ حقائق تو یہی ہیں چاہے ہمیں کتنے ہی تلخ معلوم ہوں۔ ایک تضاد ہے جو نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ پہلے جو ہوا اسے جانے دیجئے لیکن اس صدی میں پوری دنیائے اسلام میں پاکستان کے حصے میں یہ ناقابل رشک سعادت آئی ہے کہ ایک خاتون وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہیں۔ اس ملک میں جو اسلام کے نام پر بنا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام سے ہمارے معاشرے کا تعلق ہے کتنا؟ ۸۰۔ ۸۵ فیصد کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی سوچ ہی یہ نہیں' ان کا فکر ہی یہ نہیں' ان کی اقدار کا پورا ڈھانچہ (VALUE STRUCTURE) وہ ہے ہی نہیں۔ جو نماز پنج گانہ بھی نہیں پڑھتے انہیں اس سے کیا بحث کہ اسلام میں کیا حرام اور کیا حلال ہے۔ معاشرے میں عورت کا مقام کیا ہے۔ پھر یہ کہ گیارہ برس تک خود ہم نے کون سا فلسفہ چلایا ہے۔ یہی کہ عورت اور مرد کو شانہ بشانہ چلنا چاہئے۔ گویا ہم نے مغربی کلچر کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ گیارہ برس تک ہمارا طرز عمل یہ رہا کہ ہمارے تمدن اور مغربی کلچر میں کوئی فرق نہیں۔ ہمارے صدر نے امریکی شہر ہوسٹن میں پورے اطمینان سے یہ کہا کہ دیکھتے نہیں میری بیگم میرے ساتھ ہیں۔ پردہ کیا ہوتا ہے' یہ اسلام کا معاملہ نہیں ہے۔ گویا گیارہ سالہ دور کا مفتی اعظم یہی فتویٰ دیتا رہا کہ اسمبلیوں میں عورتوں کا جانا گویا مغربی کلچر کا ہی نہیں اسلام کی روح کے بھی عین مطابق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم نے اسلام کا فتویٰ اگر لینا ہوتا تو پہلے لیتی۔ قوم کا معاملہ "اعمالکم عمالکم کما تکونون کذلک فیؤمّر علیکم ہے۔ میں نے بارہا یہ حدیث آپ کو سنائی ہے لیکن آج میں تضاد (CONTRAST) کو نمایاں کر رہا ہوں۔ اس پہلو سے جتنا مجھے دکھ ہے میں ہی جانتا ہوں۔ میری ایک بات کو لے کر لوگوں نے کچھ اور رنگ دے ڈالا جو دوسرے رخ سے متعلق تھی اور جو میں ابھی بیان کروں گا۔

تصویر کا دوسرا رخ

وہ دوسرا رخ کیا ہے؟ وہ ہے جمہوریت کا رخ' اس ملک کی بقا کا تقاضا اس وقت یہ ہے کہ جمہوریت ہو تو ٹھیک ورنہ ملک چلا جاتا ہے یہ حقیقت جس طرح مجھ پر منکشف ہے شاید کسی اور پر

نہیں۔ میں نے جس طرح اس ملک میں گھوم پھر کر دیکھا ہے بلکہ پنجاب میں تو شاید ایک آدھ آدمی ہی ایسا ہو جس نے خود جا کر اندرون سندھ حالات کا مطالعہ کیا ہو۔ محمود مرزا صاحب بھی صرف شہروں تک گئے' دیہات تک نہیں گئے۔ میں دیہات کے اندر تک گیا ہوں' دادو ضلع کی گہرائی میں گوٹھوں تک گیا۔ بلاول جن کے نام پر بے نظیر صاحبہ نے اپنے بیٹے کا نام رکھا' ان کی خانقاہ تک گیا ہوں' جہاں ڈاکو کھلے عام پھرتے ہیں اور وہ ڈاکو میرے درس کے سامعین میں موجود تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ ڈاکو کل شام سے آپ کے منتظر تھے کہ آپ آئیں گے تو آپ کی تقریر سن کر جائیں گے۔ رائفلیں ان کے پاس موجود تھیں۔ میں اندرون سندھ وہاں تک گیا ہوں جہاں کوئی لاء اینڈ آرڈر نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں حالات کیا تھے' لہٰذا جس شدت کے ساتھ مجھے یہ رنج ہے کہ آج پوری دنیا میں یہ ملک ایک منکر کے حوالے سے نمایاں ہو گیا ہے تو دوسری طرف یہ راحت ہے کہ جمہوریت بحال ہو گئی جو ملکی سطح پر ہماری سالمیت کا لازمی تقاضا تھی۔ اس کی گاڑی یہاں نہیں چلنے دی گئی' اسے روکے رکھا گیا' اسلام کے خالی نعروں کے زور پر روکا گیا' لہٰذا یہ اس کا ایک ردعمل (REACTION) تھا۔ کوئی بڑا ہی کٹھور شخص ہو سکتا ہے جو اس ملک کے مستقبل اور اس کی سالمیت سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ جسے مذہبی تقاضے تو نظر آ رہے ہوں لیکن دوسرے تقاضوں سے وہ بے خبر ہو کہ اس ملک اور اس کے وجود' اس کی بقاء کیلئے اس وقت جمہوریت ناگزیر ہے ورنہ یہ ملک ٹکڑوں میں بٹ جائے گا' ختم ہو جائے گا۔ یہ دوسرا تقاضا بھی میرے سامنے اسی شدت کے ساتھ ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس مملکت خداداد کا وجود اور قائم رہنا ایک معجزہ ہے۔ مجھے تو یہ اللہ تعالیٰ کی کسی طویل المیعاد سکیم کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ پورے کرہ ارض پر اسلام کا جو غلبہ (GLOBAL DOMINATION) ہو کر رہے گا اور جس کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے' میرے نزدیک یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ دیر ہو سکتی ہے' اندھیر نہیں ہو سکتا۔

میں سمجھتا ہوں اور چار سو سالہ تاریخ کے اشاروں سے سمجھتا ہوں کہ وہ مشیت ایزدی پاکستان ہی کے حوالے سے پوری ہو گی۔ میرے نزدیک اس کی بقاء کی بڑی اہمیت ہے اور مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ اگر سندھ کو کچھ ہو گیا ہوتا' سندھ میں اگر کوئی آتش فشاں پھٹتا اور ملک دو ٹکڑے ہو جاتا تو یہ صرف پاکستان کی تباہی نہ ہوتی پورے جنوبی ایشیا یعنی بھارت' بنگلہ دیش اور پاکستان سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کی یہ تمہید بن سکتی تھی اور اندلس کی تاریخ دہرائی جا

سکتی تھی۔ سن ۹۳ ہجری اور ۷۱۲ عیسوی میں سپین کے راستے اسلام یورپ میں داخل ہوا اور اسی سال سندھ کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ یہاں محمد بن قاسمؒ آئے' وہاں طارق بن زیادؒ گئے تھے' لیکن وہاں سے اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان پانچ صدیوں پہلے مٹ چکا ہے۔ میرے جذبات کی شدت کا عالم یہ تھا کہ سوچتا رہا کہیں یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی تو نہ جائے گی۔

اس ملک کیلئے قائداعظمؒ نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ ٹی بی تیسرے درجہ کو پہنچ گئی' لیکن انہوں نے تحریک پاکستان میں دن رات ایک کر دیئے۔ قیام پاکستان کے بدترین مخالفین کا طرز عمل بھی ریکارڈ پر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ پاکستان نہ بنتا تو اور بات تھی لیکن اب بن گیا ہے' تو اس کو کوئی گزند پہنچانا اسلام کیلئے بہت برا دن ہو گا۔ مولانا مدنیؒ کا قول میں سنا چکا ہوں۔ ڈابھیل کے مدرسہ کی محفل میں پاکستان کے قیام کے سال بھر بعد ہی کسی نے مولانا کو چھیڑنے کیلئے پاکستان کی بات شروع کر دی۔ تو اس عظیم مجاہد آزادی' تدیّن' تقویٰ اور خلوص کے اس پہاڑ نے کہا کہ بھائی ایک جگہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو' اختلاف کی گنجائش ہے کہ کہاں اور کیسے بنائیں' لیکن بن جائے تو اس کی حفاظت ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔

یہی ہے وہ ملک' جس کی حفاظت کا تقاضا آج اسلام کی حفاظت کے تقاضے سے متضاد ہو گیا ہے اور یہ ہے وہ عقدہ (DILEMMA) اور (SIMULTANIOUS CONTRAST) کہ میرے نزدیک اس کی بقاء کا تقاضا جمہوریت ہے اور جمہوریت تو جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے' ویسے ہی ہو گی جیسے جمہور ہوں گے۔ جمہوریت تو دکھا دیتی ہے کہ آپ کیا ہیں کیا نہیں' آپ کا معاشرہ کیا ہے کیا نہیں' آپ کی سوچ کیا ہے کیا نہیں اور آپ کی اقدار کیا ہیں کیا نہیں۔ یہ تو

جمہوریت تو دکھا دیتی ہے کہ آپ کیا ہیں کیا نہیں۔ یہ تو گنبد کی آواز ہے جو کہو گے' سن لو گے

گنبد کی آواز ہے' جو کہو گے سن لو گے۔ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمہارے اوپر حکمران آجائیں گے' وہی تمہارے نمائندہ ہوں گے' اسی کی REFLECTION ہو گی۔

یہ ہے میری کیفیت کہ ایک طرف انتہائی رنج وصدمہ کا دن اور دوسری طرف خوشی کا موقع ہے۔ جمہوریت کی گاڑی چلی ہے۔ اب کچھ امید ہو سکتی ہے کہ فوری بحران

(CRISIS) سے یقیناً ہم بچ گئے ہیں۔ سندھ میں جو اس کے کھلے [illegible] راست نظریہ پاکستان کے معاندین تھے' ان کی [illegible] ہار [illegible] ہو گئی ہے اور وہ بالکل ناکام ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ [illegible] ری قوم پرستوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی ہے کہ اب پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا جائے [illegible]۔ لوگوں کی یہ بات کسی حد تک درست بھی ہو سکتی ہے' لیکن آپ کو

> بھٹو شاہنوں دی وفا کے جواب میں مزارعوں نے کہا "دتا دلایا کوں۔ پراوہ ساڈا تاں تے [illegible] نیند آلے"

معلوم ہے کہ وہ آخری وقت تک میدان میں رہے ہیں۔ آخری وقت تک جی ایم سید بھٹو کو گالیاں دیتا رہا ہے۔ لیکن اس وقت جو بھی ووٹ آیا' میرے نزدیک وہ پاکستان کے حق میں آیا ہے۔ اگرچہ اس سے مسائل پیدا ہوں گے' لیکن پہلی بات یہ کہ جمہوریت کی گاڑی پٹڑی پر چڑھی اور جو بحرانی کیفیت ہم پر طاری تھی وہ فی الحال ٹل گئی ہے۔ میں کوئی جمہوریت کے میدان کا سپاہی نہیں ہوں' میری ترجیح اسلام ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ ایک مریض' اگر بحرانی کیفیت میں ہے' ۱۰۶ درجہ کا بخار چڑھ گیا ہے تو تشخیص' باقاعدہ علاج اور اصل مرض کی دوا ثانوی حیثیت اختیار کرے گی۔ پہلے اس کا بخار کم کیا جائے گا۔ چاہے برف کے پانی کی پٹیاں رکھی جائیں یا کچھ اور کیا جائے۔ ہمارے ملک کو جو ۱۰۶ درجہ کا بخار چڑھا ہوا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ یہ ملک جہاں آمریت کی سیاست کے ذریعہ اور مذہب کے نام پر جس عمل کو روکے رکھا گیا تھا' وہ چلے' آگے بڑھے اور پٹڑی پر رواں دواں ہو۔ یہ ہو گیا ہے تو میرے لئے خوشی کا دن ہے۔ یہ میرے لئے امید کی ایک کرن ساتھ لے کر آیا ہے۔ میں آپ سے صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت یہی پہلو ہے میری خوشی کا کہ پاکستان میں عوامی دور کا دوبارہ آغاز ہوا ہے۔ یہ دوبارہ کا لفظ میں نے کیوں کہا ہے۔ تحریک پاکستان اور قائداعظم و قائد ملت کے زمانے کو چھوڑ دیجئے' لیکن اس کے بعد بھٹو کے مخالفین کو بھی ماننا پڑے گا کہ پہلی مرتبہ پاکستان میں عوامی سیاست کا دور بھٹو صاحب سے شروع ہوا۔

بھٹو مرحوم کے دو کارنامے

میں آج آپ سے ایک بات عرض کر دوں جو میں کراچی میں کہہ کر آیا ہوں۔ اگرچہ وہاں بڑی مخالفانہ فضا ہے' لیکن میں ڈنکے کی چوٹ پہ بات کہہ آیا ہوں۔ اپنے دوستوں سے

بارہا کہا لیکن خطاب عام میں یہ بات پہلے نہ آئی تھی کہ بھٹو صاحب نے دو کام نہایت عظیم کئے تھے' اگرچہ ان کے نتائج فوری طور پر منفی نکلے۔ پہلا کام یہ کہ انہوں نے مزدور اور کسان کو عزت نفس (SELF RESPECT) دی۔ یہ شعور بیدار کیا کہ ہم بھی انسان ہیں' ہمارے بھی حقوق ہیں۔ یہ پہلی بار ہوا ورنہ اس ملک میں ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ جملہ میں نے نجی محفلوں میں بارہا سنایا ہے' جو مجھے تو ایک صاحب نے بتایا جو دولتانہ صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ اس روایت کے مطابق دولتانہ صاحب نے اپنے مزارعوں سے پوچھا کہ "کیوں تسی اوندا ناں لیندے او۔ بھٹو تہانوں کی دتا" تم لوگ بھٹو کا نام کیوں لیتے ہو' اس نے تمہیں کیا دیا اور جواب تھا۔ "میاں جی! دتا دلایا کو۔ پر اوہ اسانداناں تے لیندا اے"۔ میاں صاحب! دیا دلایا کچھ نہیں' لیکن وہ ہمارا نام تو لیتا ہے۔ سٹیم بنا لینا ہی آخری کام نہیں' اس بھاپ کو استعمال کرنا اصل کام ہے' جس کی صلاحیت بھٹو صاحب میں ثابت نہ ہوئی۔ نتیجہ منفی نکلا' انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور صنعتی زندگی مفلوج ہو گئی۔ دوسرا جو کام انہوں نے بہت بڑا اور عظیم کیا تھا کہ سیاست جو ہمارے وڈیروں' جاگیرداروں اور کچھ سرمایہ داروں کی لونڈی اور ڈرائنگ روم تک محدود تھی' اسے سڑک اور گلی میں نکال لائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض جگہ سڑک پر اور گلی میں غنڈوں کا قبضہ تھا لہٰذا وہ غنڈوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ فوری طور پر یہ رد عمل ہوا' لیکن ہر جگہ نہیں۔ آخر سیاست جب گلی میں آئی تو وہی کچھ ہونا تھا جو کچھ وہاں ہوتا ہے۔ وہاں وڈیروں کے سے رکھ رکھاؤ اور آداب تو نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن اب امید ہے کہ یہ جو دوسرے دور کا آغاز ہوا ہے اس میں انشاء اللہ وہ منفی نتائج پیدا نہیں ہوں گے بلکہ بہتر نتائج نکلیں گے۔

سیاست میں خیر کی توقعات

بہتر نتائج کی امید کیوں؟ اپنی بیک وقت صدمہ اور مسرت کی کیفیت اور وجوہات میں بیان کر چکا ہوں' اب عرض کرتا ہوں کہ بہتری کی توقع کن کن چیزوں سے ہے۔ پہلی یہ کہ اب وہ بات نہیں رہی' فصلی بٹیروں والا دور گیا' اب پارٹی سے وابستگی (AFFILIATION) بڑی پکی ہو رہی ہے۔ پنجاب میں قومی اسمبلی کے الیکشن کے بعد صوبائی الیکشن میں جو معاملہ ہوا' وہ بہت صحت مند علامت ہے۔ اگر یہ پنجابی نیشنل ازم کا رد عمل ہے' جیسا کہ بعض لوگ کہہ رہے ہیں' تو یہ اس کا منفی پہلو ہو گا لیکن میرے نزدیک وہ پہلو دبا ہوا ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ

اب پارٹی سے وابستگی مضبوط ہے' جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب ہمارے ملک کے صدر غلام اسحاق خان صاحب نے ٹائم ٹیبل بدل دیا اور اس کے لئے انہوں نے جو دلائل دیئے وہ صحیح ہیں اور جب تین چار دن پہلے یہ طے ہو گیا تھا کہ اب بے نظیر بھٹو یہاں کی وزیر اعظم بن رہی ہیں' تب بھی پنجاب کی صورت حال میں تبدیلی نہ آئی۔ یعنی اب اراکین اسمبلی مینڈکوں

پارٹی سے وابستگی اب مضبوط ہے اور پنجاب کے ضمنی انتخاب کے نتائج نے اسے ثابت کر دیا۔

کی پسند ہری نہیں ہیں کہ آج ادھر کل ادھر اور پرسوں ادھر۔ اب ہر شخص کو سوچنا ہو گا اور اپنے لئے ایک مستقل مقام اور مستقل موقف طے کرنا ہو گا۔ یہ بھی درحقیقت ایک اچھی علامت ہے۔ گویا اب اس ملک کے اندر واقعتاً سیاست مستحکم بنیادوں پر ہو گی۔ دوسرے یہ صورت حال بھی امید افزاء ہے اور اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک پریشان کن ہے' لیکن میرے نزدیک (HOPEFUL SIGN) ہے کہ ایک بہت بڑی پارٹی اگر مرکز میں حکومت بنا رہی ہے اور دوسری کو وہاں اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے تو اسی پارٹی کو سب سے بڑے صوبے پنجاب میں اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا ہے۔ ایک بیلنس ہے جو اس ملک میں نظر آئے گا۔ بے نظیر صاحبہ کو اگر ثابت کرنا ہے کہ ان میں واقعی صحت مند روایات (HEALTHY TRAD TIONS) قائم کرنے کی صلاحیت ہے تو انہیں اپنے عمل سے دکھانا ہو گا۔ وہ بات نہ ہو جیسے ماضی میں ہوئی کہ این اے پی اور جے یو آئی کی حکومت کو بلوچستان میں زچ کر کے برطرف کر دیا گیا اور احتجاجاً صوبہ سرحد کی مفتی محمودؒ وزارت نے بھی استعفاء دے دیا۔ وہ شکل اگر ہوئی تو خود ان کی کری کرائی گیارہ برس کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا' انہوں نے گیارہ برس تک حکومت کا ٹارگٹ رہ کر بھی اپنا وجود برقرار رکھا اور ایک ٹیسٹ پاس کیا ہے لیکن ایسا ہوا تو ان کی بہت بڑی ناکامی ہو گی۔ اس سلسلے میں اپوزیشن اور حکومت کے لئے جو باتیں غلام اسحاق خان صاحب نے کہی ہیں وہ میرے نزدیک حرف آخر ہیں۔ یہ ساری باتیں ہمارے ماضی کے اعتبار سے تو شاعری معلوم ہوتی ہیں کہ یہاں ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں تو خود بھٹو صاحب نے اپوزیشن والوں کو باقاعدہ اٹھوا کر اسمبلی سے باہر پھنکوا دیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اچھی روایات موجود نہیں' تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اب صورت حال بدل گئی ہے اور اب ان (INSTITUTIONS) کو باقاعدہ چلانا ہو گا۔ اگر وہ خود

اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارنا چاہتیں اور اپنے سارے کئے دھرے کی خود ہی نفی نہیں کرنا چاہتیں تو انہیں ان تمام (INSTITUTIONS) کا پورا احترام کرنا ہو گا۔ تیسری امید افزابات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ آج پھر دہرا رہا ہوں کہ اب جب کہ ایک عوامی دور شروع ہو گیا ہے، حکومت کو کام کرنا پڑے گا۔ خالی نعروں کا دور گذر چکا ہے۔ خالی نعرہ روٹی، کپڑا اور مکان کا جو ایک دفعہ چل گیا تھا، اس دفعہ اگرچہ وہ چلا ہی نہیں، تاہم چلے گا بھی نہیں۔ اور خالی نعرہ اسلام کا بھی جو اسی وقت جواب میں چلا۔ اس دفعہ نہیں چلا اور نہ چلے گا۔ اب تو جو حکومت میں آیا اسے واقعتا کام کرنا ہو گا اور ظاہر بات ہے کہ جب حکومت ذمہ دار ہو اور ساتھ ہی جمہوری بھی تو پھر وہ پھولوں کی سیج نہیں ہوتی، کانٹوں بھرا بستر ہوتی ہے۔ ہر وقت کا دہرا احتساب اگر موجود رہے کہ ایک طرف پارلیمنٹ اور اسمبلی کے اندر ایک مضبوط و باصلاحیت اپوزیشن قدم قدم پر ٹوکنے والی ہو اور ہر نکتہ (POINT) پر حکومت ٹوٹنے کا خطرہ موجود رہے اور دوسری طرف عوامی عدالت میں بھی احتساب ہوتا ہو تو کس کی ہمت ہو گی کہ من مانی کرے۔ نعروں کا دور گیا۔ عوام اب سوئے ہوئے نہیں ہیں۔

رنج و صدمہ کا اصل سبب

مسرت و اطمینان کی کیفیت اور صدمہ و رنج کی صورت بیان کر کے میں عرض کر چکا ہوں کہ مسرت و اطمینان کی وجہ کیا ہے۔ اب بتاؤں گا کہ رنج و صدمہ کا سبب کیا ہے۔ جو کہ نتیجہ ہے دین کے ساتھ ہمارے معاشرے کے بالفعل تعلق کا۔ یہ تضاد کیوں ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والے ملک کے اندر جمہوریت جب آئی تو اس مشکل میں آئی کہ ایک طرف خوشی اور دوسری طرف صدمے کا باعث بنی ہے؟ میرے نزدیک اس میں مجرم تو خیر ہم سب ہیں۔ تاہم اس ملک کے بنانے والوں کا سب سے پہلے فرض تھا کہ یہاں اسلام کی فیصلہ کن بالادستی کا اعلان کرنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرتے۔ کوتاہی وہاں ہوئی ہے۔ بہت حیص بیص کے بعد قرارداد مقاصد پاس ہوئی تو اس لئے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آخری دھمکی دے دی تھی کہ اگر تم لوگ اس کو پاس نہ کرو گے تو پھر میں پبلک میں جاؤں گا اور صاف کہوں گا کہ تم تحریک پاکستان کے مقاصد سے غداری کر رہے ہو۔ ورنہ کتنے ہی لوگوں نے کہا تھا کہ آج جو قرارداد یہاں پاس کی جا رہی ہے، اس کی وجہ سے ہم اپنی گردن شرم کی وجہ سے اٹھا نہیں سکتے، ہم مہذب دنیا سے آنکھیں چار نہیں کر سکتے کہ ع

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں۔

لیکن بہرحال جرم میں سب شریک ہیں۔ جس نے بھی اس ملک کی فضا میں سانس لیا اور دو وقت کی روٹی کھائی' اگر اس نے اسلام کا حق ادا نہیں کیا تو وہ برابر کا مجرم ہے' سیاسی جماعتیں بھی مجرم ہیں' لیکن میں یہاں سب سے زیادہ جس بات پر زور دوں گا وہ مذہبی جماعتوں کی غلط حکمت عملی ہے۔ سب سے بڑی ذمہ داری انہی پر ہے' جو مذہب کے نام پر کام کر رہے تھے'

> سب سے بڑی ذمہ داری ان کی ہے جو مذہب کے نام پر کام کر رہے ہیں' مذہب کیلئے کام کر رہے ہیں۔

مذہب کے لئے کام کر رہے تھے اور مذہب کے نام پر سیاست کر رہے تھے۔

پہلے مرحلہ میں اپنے دینی حلقوں کو دو حصوں میں منقسم کر لیجئے۔ ایک وہ ہیں جنہیں سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ وہ اپنے درس و تدریس میں مشغول ہیں' جہاں سے ہر سال لوگ نکلتے ہیں جو مسجدوں کے خطیب بنتے ہیں' امام بنتے ہیں یا کچھ لوگ زیادہ ذہین ہوں تو انہی مدرسوں میں استاد بنتے ہیں۔ ان حضرات سے تو مجھے صرف ایک شکایت یہ رہی ہے اور آج سے نہیں یہ میں نے ۶۷ - ۶۸ء میں "میثاق" میں لکھا تھا اور مولانا بنوریؒ نے بھی "بینات" میں اداریئے لکھے تھے۔ اور اس بات کی تائید کی کہ پاکستان بننے کے بعد انہیں اپنی حکمت عملی میں جو تبدیلی کرنی چاہئے تھی' وہ نہیں کی گئی۔ انہوں نے نصاب کو بھی نہیں بدلا' وقت کے تقاضوں کو نہ پہچانا کہ پہلے انگریز کا دور تھا' جس میں انہیں صرف اسلام کی حفاظت کرنی تھی۔ چنانچہ نہ انگریزی پڑھی اور نہ کچھ اور کیا' لیکن اب تو یہ مسلمانوں کا ملک تھا' اب اس کے نظام کو چلانا تھا۔ تو جو کام انہیں کرنا چاہئے تھا نہ کیا کہ اسلام کو اس طریقے سے پیش کرتے' جو اس دور کے تقاضوں کو پورا کر سکے' اس نہج پر لوگوں کو تیار کرتے جو اس دور کی قومی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں۔ جن حضرات کا کام صرف درس و تدریس تھا' ان سے تو یہی شکایت ہے لیکن اصل اور بڑے مجرم ہیں وہ دیندار لوگ جنہوں نے سیاست کی' صرف نعرہ بازیوں سے کام لیا' جذباتی تحریکیں چلائیں' الیکشن میں اسلام کا نام استعمال کیا اور اصل کام جو کرنے چاہئیں تھے' یعنی ذہنی اور فکری تبدیلی لانا اور اخلاقی اور عملی تبدیلی برپا کرنا' ان کی طرف توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہوا میں تو بڑا جھاگ اچھلتا رہا' سوشلزم اور اسلام کی جنگ ہوتی رہی۔ لیکن معاشرے کی کیفیت دن بدن ابتر ہوتی گئی۔ معیار پست سے پست تر ہوئے۔ قومی سطح پر عمل کا حساب کر

لیں' اخلاق کے پیمانے سے ناپ لیں' گراف نیچے گیا ہے۔ قومی سطح پر دین اور عبادات کے ساتھ وابستگی کا تعلق نیچے گیا ہے۔ آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مسجدیں اب زیادہ آباد ہیں' خاص طور پر پچھلے گیارہ سال کے دور میں زیادہ لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں' لیکن یہ ساری رونق متوسط طبقہ کی ایک چھوٹی اقلیت سے ہے۔ عوام الناس میں جائیے' وہ دین سے دور سے دور تر ہوئے ہیں۔ الحاد اب آپ کے (GRASS ROOT LEVEL) ٹرانز سٹر سے کیسٹ اور پھر ٹی وی سے ہو کر نچلی جڑوں تک پہنچ گیا ہے۔ اس لئے کہ عوام تک اس کی رسائی ہے۔ الحاد اب اوپر کی سطح سے اتر کر عوام میں بھی نفوذ حاصل کر چکا ہے۔ ان کی اقدار خالص مادی بن چکی ہیں۔ تو یہ میرے نزدیک جذباتی نعرہ بازی اور سیاست میں اسلام کے نام سے فائدہ اٹھانے کی وجہ سے ہوا' جو پچھلے گیارہ برس میں اپنے انتہا کو پہنچ گیا' جس میں سیاست کی گاڑی کو روک دیا گیا تھا۔ پہلے تیس برس میں تو اپوزیشن ہی اسلام کا نعرہ استعمال کرتی تھی اور الیکشن میں ووٹ لینے کے لئے اسلام کی سرپرستی قبول کرتی تھی۔ پھر آمریت نے اسے ڈھال بنالیا۔

سیاست نے اسلام سے رسّی تڑالی

اس کے نتائج کیا نکلے؟ نوٹ کر لیجئے' اول یہ کہ معاشرے کا حقیقی' واقعی اور عملی اسلام سے تعلق کم سے کم تر ہو گیا اور دوئم زیادہ خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام ایک متنازعہ مسئلہ (COTROVERTISL ISSUE) بن گیا۔ ایک جماعت اگر الیکشن میں ووٹ لینے کے لئے اسے اچھال رہی ہے تو دوسری گویا اس کی مدمقابل خود بخود بن گئی۔ اسلام کو ایک اختلافی مسئلہ بنا دیا گیا۔ اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے والی قوت ایک ہی ہوتی تو خیر تھی' لیکن وہ چار ہوئیں تو چار اسلام وجود میں آ گئے۔ فرقہ واریت انتہائی بھیانک شکل اختیار کر گئی۔ یہ منفی نتائج ہیں جو

معلوم ہوتا ہے کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ بھی جانتی ہیں کہ پاکستانی عوام کو اسلام سے کس درجہ کا جذباتی لگاؤ ہے۔

پیدا ہوئے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ عمل پچھلے گیارہ برس میں اپنے CLIMAX کو پہنچا۔ وہاں تو سیاست کی گاڑی اسلام کے نام پر روکی گئی اور یہ الفاظ وہ ہیں جو ۸۲ء میں میں نے صدر ضیاء الحق صاحب کے نام خط میں لکھے تھے کہ خدا کے لئے آپ سیاست کی گاڑی کو چلنے

دیجئے' اسلام کے نام پر سے نہ روکئے۔ ہر عمل کا برابر ردعمل ہوتا ہے اور یہ فزکس میں نیوٹن کا تیسرا اصول ہے۔ چنانچہ گیارہ سال بندھی رہنے کے بعد اب سیاست کی گاڑی رسہ تڑا کر بھاگی ہے تو اسلام سے اس کا کوئی آس پاس کا بھی تعلق نہیں رہا۔ یہ آپ ہی کے تو عوام ہیں' جنہوں نے ووٹ دیئے ہیں۔ کس کو معلوم نہیں کہ عورت کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ جس زمانے میں خواتین کے بارے میں بحث چل رہی تھی' میں نے کہا کہ چاہے کوئی مسلمان پردہ کرتا ہو یا نہ کرتا ہو' اس کے گھر میں پردہ نہ بھی ہو تب بھی وہ جانتا ہے کہ اسلام میں پردہ ہے۔ جیسے کون نہیں جانتا کہ اسلام میں سود حرام ہے۔ چاہے مجبوری اور بہانے سے اس میں مبتلا ہوں' لیکن جانتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ کون نہیں جانتا تھا کہ اسلام میں عورت کا مقام یہ نہیں ہے' اس کے باوجود وہ منتخب ہو کر آئی ہیں تو میں اس کو تعبیر کر رہا ہوں کہ اب سیاست کی گاڑی نے لگام تڑوالی ہے' جسے اسلام کے نام پر گیارہ سال روکے رکھا گیا۔

بہرحال اب بھی موقع ہے کہ ہم اپنے عمل کی اصلاح کریں' سبق حاصل کریں اور کوتاہیوں کو درست کریں۔ اس سلسلے میں دینی جماعتوں کو کیا کرنا چاہئے۔ وہ تو میں اگلی مرتبہ بیان کروں گا' مجھے اس وقت بے نظیر صاحبہ سے اپنی اس گفتگو کے پس منظر میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

نئی وزیراعظم کے لیے مشورے

حکومت بے نظیر بھٹو کو مل رہی ہے اب انہیں چاہئے کہ جمہوریت کی مسلمہ روایات کی پوری پاسداری کریں۔ اپوزیشن کو اس کا جائز حق دیں اور اس کو ساتھ لے کر چلنے کی پوری کوشش کریں۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کو پیپلز پارٹی بحیثیت مجموعی اور محترمہ بے نظیر صاحبہ اپنے سامنے ذاتی طور پر رکھیں کہ اگر وہ واقعتاً اس ملک کو مستحکم دیکھنا چاہتی ہیں' اگر وہ اس قوم وملک کے اندر ایک نئی تازہ حیات پیدا کرنا چاہتی ہیں' تو دو باتوں کو جانے اور مانے بغیر چارہ نہیں۔ نمبر ایک یہ کہ اس ملک کے لئے واحد وجہ جواز اسلام ہے۔ کوئی شے اس کو جواز نہیں دے سکے گی۔ چاہے کتنی ہی جمہوریتیں آجائیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیں ایک بڑے زبردست دشمن کا مقابلہ کرنا ہے۔ وہ ایک بہت بڑے ویکیوم کی طرح ہمیں کھینچ رہا ہے۔ اس کی مالی حیثیت' اس کا معاشی استحکام اور اس کی فوجی قوت ہم سے بہت بڑھ کر ہے۔ دنیا میں کوئی اور ملک ایسا نہیں ہے' جو دشمنوں کو ساتھ لے کر پیدا ہوا ہو۔ ایک مثال البتہ

اسرائیل ہے' لیکن اسے امریکہ کی پوری پوری پشت پناہی حاصل ہے۔ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی عالم عرب سے اس کی پیدائشی دشمنی وجود میں آگئی تھی۔ بھارت کو ہم سے پیدائشی دشمنی ہے۔ اس کا کلچرل دیکیوم بھی ہے جو ہمیں کھینچتا ہے۔ لسانی بنیاد پر وہ ہمیں کھینچتے ہیں' کلچرل اور ثقافت کے طائفے ان کے محبت بھرے گیت الاپتے ہوئے آئے ہیں' شعراء آئے ہیں نظمیں کہتے ہوئے۔ ان کا ٹی وی کے ذریعے سے ہم پر الگ کلچرل حملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ محض جمہوریت کی بحالی سے ملک مستحکم نہیں ہو سکتا۔ بحران ختم ہو گیا ہے اور صحیح ہے کہ جمہوریت سے رفع ہوا' لیکن اس کا استحکام مثبت طور پر صرف اور صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ بات بھی صدر غلام اسحاق خان صاحب نے کہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس پر پورا زور دیا جائے۔ تیسری بات جو میں بتانا چاہتا ہوں' اس سے اہم تر ہے۔ اس قوم میں' جو بظاہر بڑی مردہ نظر آتی ہے' بڑا دم خم (POTENTIAL) ہے۔ بہت قوت ہے' بہت صلاحیت ہے لیکن ہر قوم میں اس کی خوابیدہ صلاحیتوں اور قوتوں کو ایک طریقے سے بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز اس کے جذبات کو اپیل کرے' اس کے اندر ہلچل پیدا کر دے' جو اس کے اندر کسی مقصد کے لئے تن من دھن لگا دینے کا جذبہ پیدا کرے اور جو اس کے لئے گردنیں کٹوانے کی آرزو پیدا کر دے' وہ جذبہ اس قوم میں صرف اور صرف اسلام کے ذریعے سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کوئی اور اپیل نہیں یہاں کوئی دنیاوی اپیل کام نہ آئے گی۔ میں منفی راستہ نہیں دکھا رہا کہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنی جگہ ہے' اس کا حق جائز ہے اور ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ سب حقوق واجب ہیں لیکن اس قوم کے اندر سے ان قوتوں کو' جذبات کو اور اس کی خوابیدہ صلاحیت کو اگر بر آمد کرنا ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام کے حوالے سے ہو گا۔ ان حقائق پر غور کر لیں' علم سیاست (POLITICAL SCIENCE) کے جو بھی مسلمہ اصول ہیں ان کے حوالے سے غور کر لیں' میری کتاب "استحکام پاکستان" کا مطالعہ کر لیں اور اس میں اگر کوئی بات غلط ہے تو مجھے بتائیں۔ میں نے اس اعتبار سے بارہا یہ مصرعہ پڑھا ہے کہ ع

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

ہماری قوم سیکولرازم کو AFFORD ہی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے تو واحد بنیاد اسلام ہے۔ مجھے بے نظیر بھٹو صاحبہ کی دو باتوں میں امید کی کرن نظر آئی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں اور یہ بھی امید افزا بات ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ میں سب سے پہلے عمرہ کروں گی اور یہ کہ نماز کے وقت تمام کاروباری مراکز بند کر دیئے جائیں گے' حوصلہ افزاء

ہے۔ چاہے انہوں نے خالص ڈپلومیٹک انداز میں یہ باتیں کہی ہوں۔ خلوص و اخلاص اور نیت تو اللہ جانتا ہے 'ہم نہیں جانتے۔ چلئے آپ شک بھی کر لیجئے تب بھی یہ تو ثابت ہو گیا کہ انہیں معلوم ہے اس قوم کو کیا چیزیں پسند ہیں اور کن باتوں سے اس قوم کا دل جیتا جا سکتا ہے۔ بھٹو صاحب نے بھی دو کام کئے تھے 'لیکن وہ تھی بھاگتے بھاگتے کرنے والی بات۔ انہوں نے جمعہ کی چھٹی اور شراب کی بندش اگرچہ اس وقت کی تھی 'جب ان کی کرسی ڈول چکی تھی۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ اب میرا چل چلاؤ ہے 'یہ جاتے جاتے کی بات اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن اسی طرح جاتے جاتے ضیاء الحق صاحب نے بھی شریعت آرڈی نینس نافذ کیا جو بھاگتے چور کی لنگوٹی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دونوں مثالیں میرے نزدیک برابر ہیں 'لیکن بے نظیر بھٹو کا معاملہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس وقت پاور میں آ رہی ہیں۔ اس وقت ان کا سر بہت اونچا ہے 'بڑی زبردست فتح حاصل ہوئی ہے 'پوری دنیا کی نگاہیں ان پر مرتکز ہیں 'پوری دنیا سے اخباری نمائندے آئے ہوئے اور ان سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ اس وقت اگر انہوں نے سمجھا ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کی نفسیات کیا ہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی وہ ان سب حقیقتوں کو پیش نظر رکھیں گی۔

ہر ستم کے بال بیرنگز کے مرکز

سندھ بیرنگ ایجنسی ۶۵۰ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز۔ کراچی۔ فون: ۷۲۳۳۵۸ ۷۲۱۱۷۲
خالد ٹریڈرز۔ بالمقابل کے۔ ایم۔ سی ورکشاپ۔ نشتر روڈ۔ کراچی
فون: ۷۳۵۸۸۲ — ۷۳۲۹۵۲ — ۷۳۰۵۹۵

موجودہ سیاسی حالات میں
مذہبی اور دینی جماعتوں کے لیے لائحہ عمل

امیر تنظیم اسلامی کے ۹ دسمبر ۸۸ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

پچھلے جمعہ میں عرض کر چکا ہوں کہ حالیہ انتخابات کا پرامن' آزادانہ اور منصفانہ ہونا خوشی کی بات ہے اور یہ امر بھی باعث اطمینان ہے کہ انتقال اقتدار بھی خوبی سے ہوا' جسے پوری دنیا مانتی ہے۔ انتخابی نتائج سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ ایک طرف تو ہمارے معاشرے میں مذہبی اور دینی سیاسی جماعتوں کا مجموعی عمل دخل بہت کم ہے۔ ان گیارہ سالوں کے دوران اثرات میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ بعض اعتبارات سے کمی واقع ہوئی ہے اور دوسری طرف اس واقعہ کی علامتی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ تمام دینی حلقوں کے اس مسئلہ پر اتفاق کے باوجود کہ مسلمان ملک میں عورت کی سربراہی اسلام کے مزاج کے خلاف ہے' ایک خاتون وزیراعظم منتخب ہوئی اور اچانک نہیں ہوئی کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے کا مطلب بے نظیر بھٹو کو اس منصب پر فائز کرنا ہے۔ یہ بھی تفصیل سے بیان کیا کہ ہمارے معاشرے میں لوگوں کے دین سے تعلق کا کیا حال ہے ——— ہماری پچاسی' نوے فیصد آبادی کا دین سے واسطہ محض نام کا ہے۔ باقی دس' پندرہ فیصد کا تصور دین بھی نہ صرف محدود ہے بلکہ مسخ شدہ بھی۔ کھانے پینے میں حرام حلال کے علاوہ بس نماز روزے کا اہتمام ہے' جس کے ساتھ ہر طرح کے حرام کام بھی چلتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہماری نوخیز نسل کے حساس حصے کو دین سے بدظن کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے نصف کو دین کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کا شعور حاصل ہے اور خواہش بھی ہے کہ وہ دنیا میں رائج و نافذ العمل ہو' لیکن بس گفت و شنید تک ورنہ پوری توانائیاں دنیا کمانے اور اسے سجانے میں صرف ہوتی ہیں۔ لے دے کر دو تین فیصد لوگ ہمارے معاشرے میں ایسے پائے جاتے ہیں جو کچھ کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ اپنی توانائیاں دین کے کاموں میں لگاتے ہیں اور کسی نہ کسی تنظیم سے منسلک ہیں لیکن ان کا بھی المیہ یہ ہے کہ آپس میں دست و

نوائے وقت کا اداریہ

دینی جماعتوں کا شوق سیاست - لمحہ فکریہ!

تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے خطبہ جمعہ کے دوران تجویز پیش کی ہے کہ ملکی سیاست کی گاڑی کو معاشرے کے مجموعی مزاج کے مطابق چلنے دیا جائے اور کسی مذہبی مسئلے پر عوام کو مشتعل کر کے اس گاڑی کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں کے کردار کے پیش نظر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانے سے نہ سیاست کو فائدہ پہنچا ہے اور نہ دین اور اس کے علمبرداروں کو۔ اس لئے علمائے کرام اگر سیاسی میدان میں کوئی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں میں شامل ہو کر ان کا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ بریلوی مکتب فکر کے علمائے کرام تحریک پاکستان کے زمانے کی طرح آج بھی مسلم لیگ میں شامل ہو کر ایک مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے باقی دینی جماعتوں کو بھی مشورے دیئے ہیں اور ان کے استدلال سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ حالیہ انتخابات میں دینی جماعتوں کے حصے میں کوئی بڑی کامیابی نہیں آئی بلکہ ان کی وجہ سے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ میں سے کسی کو واضح اکثریت حاصل نہیں ہو سکی جس کی بناء پر موجودہ حکومتی نظام میں بے حد عدم توازن پایا جاتا ہے اور کسی ایک فریق کو اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔ اس پس منظر میں اگر دینی جماعتیں کم از کم آئندہ انتخابات کے لئے حکمت عملی اپنا سکیں کہ وہ ملک کی دو بڑی جماعتوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دیں اور اس کے اندر شامل ہو کر اسے اپنے طرز فکر سے متاثر کرنے کی کوشش بھی کریں اس سے کم از کم آئندہ انتخابات میں کسی ایک سیاسی پارٹی کو اکثریتی ووٹ مل سکے گا اور جمہوری نظام کے اندر جو موجودہ کھینچا تانی شروع ہے اس کا خاتمہ ہو سکے گا۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ملک میں دو یا تین جماعتوں کو پنپنے کا موقع مہیا کرنے کے لئے ہمارے علمائے کرام بلند ہمتی کا مظاہرہ کریں گے اور دینی جماعتوں کو خالصتاً مذہبی تعلیمات کے فروغ کے لئے وقف کرتے ہوئے سیاسی شوق پورا کرنے کے لئے اپنی اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کر لیں گے۔ ڈاکٹر اسرار کا یہ مشورہ صائب ہے کہ چونکہ بریلوی مکتب فکر کے علماء کرام تحریک پاکستان میں سرگرم کردار ادا کر چکے ہیں اس لئے اب ان کا مسلم لیگ کے ساتھ چلنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبدالستار نیازی کے لئے کوئی فیصلہ کرنا بہت آسان ہے کیونکہ وہ اقبالؒ و

قائدؒ کے پیروکار ہیں اور ان کی جماعت کو تقویت پہنچانے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے۔
رہی یہ بات کہ موجودہ مسلم لیگ ان کے تصورات پر پوری نہ اترتی ہو تو اس کے لئے مولانا نیازی اور ان کے ساتھی جید علمائے کرام مسلم لیگ کے مزاج کو صحیح خطوط پر ڈھالنے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں۔ اس طرح دیوبند مکتب فکر کے بعض علماء کو ماضی میں مسلم لیگ کے مخالف جماعت کے ساتھ چلنے میں کوئی راحت ملتی تھی تو ان کے لئے اب پیپلز پارٹی کا ساتھ دینے میں آسانی ہے۔ جے یو آئی (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) نے ایم آر ڈی کے اندر ایک عرصے تک پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کی ہے اور محض انتخابات کے موقع پر الگ راستہ اختیار کیا ہے جب کہ تشکیل حکومت کے مرحلے میں غیر جانبداری کا اعلان کرنے کے باوجود بیگم بے نظیر کے ساتھ "شانے سے شانہ ملا کر چلنے" کی پالیسی اپنانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس طرح اگر انہیں پسند ہو تو وہ من وتوکی تمیز ختم کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کی عملی سیاست کا حصہ بن سکتے ہیں تاکہ کم از کم انتخابات میں ایک تو لوگوں کے ووٹ ضائع نہ ہوں اور دوسرے ووٹ تقسیم ہو کر غیر مستحکم سیاسی نظام کو جنم نہ دیں۔ حالیہ انتخابات میں دیگر مذہبی گروپوں نے بھی اپنے اپنے نام سے شرکت کرنا ضروری سمجھی لیکن انہیں کامیابی نہ ہو سکی جماعت اسلامی اپنے آپ کو دینی اور سیاسی جماعت کہلاتی ہے اور تقریباً نصف صدی کی جدوجہد کے باوجود نہ تو اس کے ارکان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ بڑھ سکی ہے اور نہ اسے انتخابات میں چند سیٹوں سے زیادہ حصہ ملتا ہے جس سے اس کے سیاسی امیج کو چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اسرار صاحب چونکہ پرانے جماعتیئے ہیں اس لئے انہیں اپنے سابق ساتھیوں سے خود ہی گفتگو کرنی چاہئے اور انہیں اپنے مؤقف کا قائل کرنا چاہئے۔ جماعت اگرچہ اس وقت ایک انتخابی اتحاد میں شامل ہے لیکن سیاسی اور انتخابی اتحادوں کی ماضی کی تاریخ خاصی مایوس کن ہے اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ جماعت اپنا سیاسی کردار مسلم لیگ کے اندر شامل ہو کر پورا کرے تاکہ کم از کم یہ جماعت تو ضروری طاقت حاصل کر سکے۔ اور آئندہ انتخابات کے نتائج کسی ایک پارٹی کے حق میں واضح ہو سکیں۔ آج بہر حال جو سیاسی عدم استحکام نظر آرہا ہے اس کی وجہ سیاسی اور انتخابی پارٹیوں کی کثرت ہے۔ اگرچہ کافی جماعتیں تو مکمل طور پر مسترد کر دی گئی ہیں تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑنے کے رجحان کی بھی حوصلہ شکنی کی جائے اور آئندہ کے لئے چند بڑی جماعتوں کو ابھرنے کا موقع دیا جائے تاکہ عوام ان میں کسی ایک کے بارے میں دوٹوک فیصلہ دے سکیں اور موجودہ عدم استحکام کی کیفیت دوبارہ پیدا نہ ہو۔

(اتوار - ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۸ء)

گریبان ہیں۔ یہ لوگ بھی ایک مٹھی کی طرح متحد ہوں تو اثر انداز ہو سکتے ہیں' لیکن اختلاف اور تفرقہ سے ان کی مجموعی قوت بھی غیر مؤثر ہو گئی ہے۔ ہم لوگوں کا اسلام تو اعمال سے ظاہر ہوتا ہے اور خوب ظاہر ہو رہا ہے۔ ایمان کے اعتبار سے بھی صورت حال مایوس کن ہے۔ ایمان میں اتنی جان نہیں کہ عمل پر اثر انداز ہو سکے۔

تاہم مجھے یقین ہے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ کے وعدے اور حضورؐ کے فرامین پر اعتماد ہے اسے ماننا پڑے گا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہو گا اور پاکستان کا معاملہ منفرد ہے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا چنانچہ جسے بھی یہاں بساط حکومت بچھانے کی خواہش ہے اور ملک کو توڑنے کی بجائے صحیح سالم رکھنے کی آرزو ہے' اسے لازماً اسلام کا نام تو لینا ہی پڑے گا۔ طوعاً و کرہاً لے' یا دلی آمادگی سے' کیونکہ اس خطۂ ارضی کے پس منظر میں چار صدیوں کا احیائی اور تجدیدی کام موجود ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے شروع ہوا۔ اور گزشتہ نصف صدی میں تو یہاں جو کام ہوا' اس کی نظیر پوری دنیا میں موجود نہیں۔ اس کام کے اثرات بکھرے ہوئے ہیں' معدوم نہیں ہوئے۔ اہل دین باہم دگر الجھے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں اتفاق و اتحاد کی شکل پیدا ہو جائے تو صورت حال مایوس کن نہیں امید افزا ہو گی۔ ملک کے موجودہ حالات اور وقت کے تیور مذہبی اور دینی جماعتوں سے کس طرز عمل اور کون سی حکمت عملی کا تقاضا کرتے ہیں' اس کے بارے میں میری مخلصانہ اور مؤدبانہ گزارشات التفات سے سنی جانی چاہئیں اور مناسب معلوم ہوں تو قبول بھی کی جائیں۔

سیاست کی گاڑی چلنے دی جائے

جہاں تک ملکی سیاست کا تعلق ہے اسے معاشرے کے مجموعی مزاج کے مطابق چلنے دیا جائے۔ اس میں فوری تبدیلی کی خواہش تو رکھی جا سکتی ہے لیکن بحالات موجودہ ممکن نہیں۔ اس گاڑی کو چلنے دیا جائے۔ کسی مذہبی مسئلے کو اٹھا کر اور عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے آپ چلتی گاڑی کو روک تو سکتے ہیں۔ وہ رک جائے گی لیکن صحیح سمت میں اڑے گی نہیں۔ اور اس رک جانے کا ملک و قوم کو شدید نقصان ہو گا۔ سیاست کی سمت میں جو ارتقاء ہو سکتا ہے' سیاسی روایات جو قائم ہو سکتی ہیں اور سیاسی شعور نکھر کر حکمرانوں کے احتساب کا جو رواج ڈال سکتا ہے' اس کا امکان معدوم ہو جائے گا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو نظامہائے باطل میں بھی موجود ہیں۔ ایک حدیث مبارک کا' جس کی سند اس وقت میرے پاس موجود نہیں' مفہوم ہے کہ

حکومت کفر کے ساتھ تو چل سکتی ہے، ظلم کے ساتھ نہیں چلتی۔ ہمارے ہاں بھی سیاست کی گاڑی چلی تو رفتہ رفتہ ظلم کا خاتمہ ہو گا۔ اسے چلنے دیا جائے۔ وقتی شوشے چھوڑ کر اسے روک دینے کو اپنی کامیابی سمجھنا بہت مہلک ثابت ہو گا۔ اور یہ چلے گی تو اس میں چلن سکہ رائج الوقت کا ہی ہو گا۔ جاگیرداری، سرمایہ داری، برادری، پیری مریدی اور پیسہ ہی بروئے کار آئے گا۔ فیصلہ کن عمل دخل انہی عوامل کا رہتا ہے چاہے معاملہ مسلم لیگ کا ہو یا پیپلز پارٹی کا۔ ان جماعتوں میں لوگوں کی آمدورفت نظریاتی وابستگی کے سبب نہیں ہوتی۔ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ ایک طرف ہوتے ہیں تو کچھ دوسری طرف۔

جمعیت علمائے پاکستان کو مشورہ

البتہ جو لوگ سیاست میں مذہبی عامل کو بھی کسی نہ کسی درجے میں داخل کرنا چاہتے ہیں، ان سے عرض کروں گا کہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت میں داخل ہو کر یہ کام کریں۔ وہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر اپنی علیحدہ تنظیمیں بنا کر جب یہ کام کرتے ہیں تو اس سے دین کو نقصان پہنچتا ہے اور سیاست کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ دین کو نقصان ہوتا ہے کہ فرقہ واریت اور گہری، اور پختہ ہو جاتی ہے اور سیاست کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا بھی ہے تو وقتی اور بے حقیقت۔ فضل حق صاحب کو ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے مولانا سمیع الحق کی رفاقت اختیار کر لی اور نواز شریف صاحب کو حاجت تھی تو جماعت اسلامی کو ساتھ لے آئے، حالانکہ ان کے درمیان کوئی ذہنی، فکری اور مزاجی ہم آہنگی نہ پہلے تھی، نہ اب ہے۔ ماضی میں تحریک پاکستان کے دوران جو علماء مسلم لیگ میں شامل ہوئے انہوں نے عوام کے مذہبی تصورات سے ہم آہنگ ہونے کے باعث مثبت کردار ادا کیا۔ آج بھی یہ حضرات قومی جماعت میں شامل ہو جائیں تو مؤثر ہو سکتے ہیں۔ آج بھی مسلم لیگ کے احیاء کا ایک سنہرا موقع ہے۔ میں نے پیپلز پارٹی کے بارے میں کہا کہ وہ ایک مضبوط جماعت کے طور پر ابھری اور اس نے اپنا وجود ثابت کر دیا ہے تو لوگوں نے برا منایا حالانکہ سیاسی جماعتوں کا استحکام ملک کی سیاست کے لئے خوش آئند ہے۔ مسلم لیگ کے بارے میں بھی میری خواہش تھی اور ہے کہ وہ اپنی تاریخی حیثیت کا ادراک کرے۔ ماضی میں اس نے شاندار کارنامہ انجام دیا اور آج بھی کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔ اس نے اپنے تشخص سے محروم ہو کر نقصان اٹھایا ہے۔ اسلامی جمہوری اتحاد میں مدغم ہو کر اس نے کوئی وقتی سا فائدہ اٹھا لیا ہو تو علیحدہ بات ہے ورنہ بحیثیت جماعت وہ گھاٹے میں رہی۔ شخصی اعتبار سے کسی کا بھلا ہو گیا ہو تو نہیں کہہ سکتا اور مسلم لیگ کونسل کے اجلاس

اسلام آباد میں وہی باتیں کہی گئیں جو میں کہتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد سے نہ مسلم لیگ کو فائدہ ہوا اور نہ جماعت اسلامی کو۔ میں نے انتخابات اور اتحاد بننے سے پہلے ہی مولانا نورانی میاں کو مشورہ دیا تھا کہ کوئی مؤثر کام کرنا چاہتے ہیں تو مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ ان کے اسلاف نے بھی یہی کیا تھا۔ اپنی علیحدہ جماعت نہ بنائی اور مسلم لیگ کو تقویت دی۔ دیوبندی حلقے کے بھی تھانوی گروپ نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ مسلم لیگ کا احیاء وقت کی ضرورت

پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا بھائیو ایک دفعہ اور پڑھ لو' اگر جماعت اسلامی کی حکومت آ گئی تو درود پر پابندی لگ جائے گی۔

ہے' اس میں جماعتی عہدوں کو حکومتی مناصب سے الگ کر دیا جائے اور جو لوگ عوامی مزاج کے مطابق مذہبی تصورات رکھتے ہیں' انہیں اس میں شامل ہو کر مؤثر کردار ادا کرنا چاہئے۔

دوسرے دینی حلقے سے گزارش

ان کے برعکس اہل حدیث حضرات' دیوبندی مسلک کے لوگ اور جماعت اسلامی والے میرے نزدیک قومی سیاسی میدان میں کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ان تینوں کو بریکٹ کر کے ایک لفظ "وہابی" ان پر چسپاں کر دیا جاتا ہے اور عوام کی اکثریت کسی کافر اور ہندو کے مقابلے میں وہابی سے زیادہ بدکتی ہے۔ مسلم لیگ کو بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نواز شریف صاحب اور جنرل فضل حق جیسی بعض شخصیات کو وقتی ضرورت لاحق ہو گئی تھی ورنہ مجھے بتایا گیا ہے کہ بعض مقامات پر یہ انتظام کیا گیا کہ جماعت اسلامی کے لوگ زیادہ نمایاں نہ ہوں' پیچھے رہ کر کام کریں ورنہ ہمیں ووٹ نہ ملیں گے۔ محنت اور بھاگ دوڑ ان کی تھی لیکن چونکہ گستاخ رسولؐ' وہابی اور پیروں فقیروں کے منکر کے طور پر مشہور تھے لہٰذا عوام میں ان کی پذیرائی مشکوک رہی۔ ایک لطیفہ نما واقعہ ہے' لیکن اس سے صورت حال کا اندازہ لگانے میں مدد ملے گی۔ مولانا شفیع اوکاڑوی مرحوم ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی کے مقابلے میں الیکشن لڑ رہے تھے۔ اپنے ایک انتخابی جلسے میں انہوں نے لوگوں سے کہا کہ لو بھئی درود پڑھ لو۔ پڑھا گیا تو کہا ایک بار اور پڑھ لو۔ پھر کہا ایک بار اور۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا بھائیو ایک دفعہ اور پڑھ لو' اگر جماعت اسلامی کی حکومت آ گئی تو درود پر پابندی لگ جائے گی۔ خود ہی سوچ لیجئے کہ مجمع پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔

سیاسی میدان میں مقابلہ ہوا تو ان لوگوں کو ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہو گا۔ یہ لوگ سیاست میں مؤثر نہیں ہو سکتے۔ عوام کی اکثریت کی مذہبی سوچ اور مزاج کو تو یہ لوگ شرک کہتے ہیں' بدعت اور دین کی روح کے منافی قرار دیتے ہیں اور یہیں سمجھ لیجئے کہ بریلوی علماء سیاست کے میدان میں کیوں آئے' جمعیت علمائے پاکستان کیوں متحرک ہوئی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مذہب کے نام پر ووٹ مانگے جا رہے ہیں تو سوچا کہ اس کے تو ہم زیادہ حقدار ہیں۔ ملک کا سواد اعظم تو ہمارے خیالات اور مذہبی تصورات سے قریب تر ہے۔ اسی بات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں گروہ یعنی اہل حدیث' دیوبندی اور جماعت اسلامی' انتخابی سیاست میں کامیابی کے جھنڈے نہیں گاڑ سکتے کیونکہ ان پر وہابیت کی پھبتی چست کر دی جاتی ہے۔

مولانا داؤد غزنویؒ کی فراست

حال ہی میں میں نے مولانا داؤد غزنویؒ کے بارے میں ایک واقعہ پڑھا اور پھر اس کے راوی جناب اسحاق بھٹی نے خود بھی مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے مولانا مرحوم سے' جو جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے' کہا کہ ہم سیاسی طور پر منظم ہو کر انتخابات میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ مولانا خاموش رہے۔ کچھ دنوں بعد پھر کہا تب بھی چپ سادھے رکھی۔ تیسری دفعہ اپنی بات دہرائی تو مولانا مرحوم نے فرمایا کہ مولوی صاحب میں تمہیں عقلمند آدمی سمجھتا تھا' لیکن تم تو عقل سے کورے ہو۔ جیسے ہی ہمارا کوئی آدمی سیاست کے میدان میں اترا' اسے وہابی کا لیبل چسپاں کر کے ناکام بنا دیا جائے گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو کر اس کا ٹکٹ لیں اور اس کے منشور کی بنیاد پر الیکشن لڑیں۔ اس صورت میں تو کوئی امکان ہو سکتا ہے'

> ماضی میں جب مسلم لیگ اور جماعت اسلامی ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوئیں تو کیا لیگ والوں نے تاریخ کھول کر نہ رکھ دی تھی؟۔

بصورت دیگر نہیں۔ دیوبندی حلقے کے تھانوی گروپ نے بھی اس حقیقت کو خوب سمجھا۔ انہوں نے کبھی سیاست میں حصہ نہ لیا۔ درس و تدریس میں مشغول رہے' تصنیف و تالیف کی اور دار العلوم چلائے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا سیاست میں گزر ہی نہ ہوا۔ ان کے جو شاگرد رشید اس میں آئے' وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر آئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنے اپنے علاقوں میں بہت کام کیا۔ تبلیغی جماعت نے بھی' جو خود

دیوبندی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں' اس نکتہ کو خوب سمجھا ہے۔ اگرچہ اجتناب میں حد سے بڑھ گئے ہیں تاہم وہ سیاست میں ٹانگ ہی نہیں اڑاتے' جانتے ہیں کہ اگر ہم مدمقابل بن گئے تو ہماری بات کون سنے گا۔

دیوبندی حلقے کا ایک گروہ البتہ کچھ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور میں اس میں مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق دونوں کے گروپ جمع کر رہا ہوں۔ یہ ایک ہیں' ایم آر ڈی میں شمولیت کے سوال پر دو حصوں میں تقسیم ہوئے اور جلد یا بدیر اکٹھے ہو جائیں گے۔ لیکن جغرافیائی اعتبار سے ان کا حلقہ اثر محدود ہے۔ صوبہ سرحد سے شروع ہو کر بلوچستان کے پختون علاقے ژوب تک ایک پٹی چلی جاتی ہے جس میں عوامی سطح پر مذہب کو اثر و نفوذ حاصل ہے۔ تہذیب و ثقافت میں بھی مذہب کے اثرات موجود ہیں اور نماز روزے کی پابندی بھی ہے۔ اسی علاقے سے مولانا مفتی محمودؒ نے بھٹو صاحب کو اس وقت شکست دی جب وہ طوفان کی طرح چڑھے تھے۔ اب وہیں سے ان کے فرزند ارجمند ڈٹ کر کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی جمعیت علمائے اسلام نے بلوچستان میں خاصی سیٹیں لی ہیں۔ دونوں دھڑوں کا ملا جلا اثر اس پختون پٹی میں اور پنجاب کے ملحق علاقوں میں موجود ہے' لیکن باقی ملک میں کوئی حیثیت نہیں۔ کسی جوڑ توڑ اور گٹھ جوڑ کے ذریعے ہی کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ مفتی محمودؒ کو سرحد کی وزارت علیا بھی مل گئی تھی لیکن کتنے دن چلی۔ اس دفعہ یہاں تک سننے میں آیا کہ مولانا فضل الرحمٰن کو وزارت عظمیٰ کی پیشکش ہوئی ہے۔ کوئی بڑا گروہ اپنی کسی وقتی مصلحت کے تحت ایسے چھوٹے گروہوں کو کوئی عارضی اہمیت دے بھی سکتا ہے' لیکن اس سے زیادہ کوئی پائیدار اثر ملکی سیاست پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔

جماعت اسلامی کا معاملہ

جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے' اس کا معاملہ پاکستان کی موجودہ سیاست میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ اہم ترین گروہ ہے جس کی تفصیل میں آگے بیان کروں گا' لیکن اس وقت میں اس کے کمزور پہلو سامنے لا رہا ہوں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے بانی اور قائد مولانا مودودی مرحوم نے مولانا حسین احمد مدنیؒ' مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیت علمائے ہند پر شدید ترین تنقیدیں کی تھیں۔ ان حضرات کے عقیدت مند وقتی ضرورت کے تحت اکٹھے ہو سکتے ہیں جیسے شریعت محاذ میں بھی جمع ہو گئے تھے' لیکن جن کے بزرگوں کو مولانا مودودی مرحوم نے کفر تک پہنچا دیا' وہ جماعت اسلامی کو کبھی معاف نہیں کر

سکتے۔ اسی طرح تحریک پاکستان کی مخالفت 'اس سے علیحدگی' یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن سے بھی لاتعلقی تاریخی حقائق ہیں اور فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ مولانا مرحوم نے جس طرح قائداعظم کی مخالفت قیام پاکستان سے پہلے اور بعد بھی کی۔ اس نے مسلم لیگ والوں کے سینے چھلنی کر دیئے تھے اور وہ سب ان کی یادداشت میں بھی محفوظ ہے چنانچہ جہاں بھی سینئر مسلم لیگی جمع ہوتے ہیں ویسی ہی باتیں سننے کو ملتی ہیں جیسی جماعت اسلامی کے بارے میں مسلم لیگ

> تجدیدی مساعی سے لوگوں میں دو خوبیاں پیدا ہوں گی۔ ایک مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کی قوت ارادی اور دوسرے دین کا فہم و شعور۔

کونسل کے اجلاس اسلام آباد میں کہی گئیں۔ کسی وقتی مصلحت کے تحت ان کا ساتھ ہو سکتا ہے 'مسلم لیگ ضرورت پڑنے پر جماعت اسلامی کو استعمال ضرور کرلے گی' لیکن سیاسی سطح پر ان میں کوئی پائیدار رفاقت ممکن نہیں۔

ماضی میں جب مسلم لیگ اور جماعت اسلامی ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہوئیں تو کیا لیگ والوں نے تاریخ کھول کر نہ رکھ دی تھی؟۔ اپنے اپنے وقت میں لیاقت علی خاں' سردار عبدالرب نشتر' اشتیاق حسین قریشی اور محمود حسین قریشی جیسے لیگی زعماء نے کیا جماعت کو آئینہ نہیں دکھایا۔ آج اگر ایسا نہیں ہو رہا اور زبانوں پر مصلحت کے قفل پڑے ہوئے ہیں تو یہ نہیں کہ تاریخ سے ان ابواب کو نکال دیا گیا ہو۔ پھر جماعت اسلامی عقائد کی بات بھی کرتی ہے۔ دینی تصورات اور ان کے عملی پہلوؤں پر بھی ایک نقطہ نظر رکھتی ہے جو عوام میں موجود نہیں لہٰذا جماعت کے لئے انتخابی میدان میں کوئی مؤثر کردار ادا کرنا قطعاً ممکن نہیں۔ جو کام یہ کر سکتی ہے' وہ بہت اہم اور حد درجہ قیمتی ہے۔

کرنے کا اصل کام

جن تین طبقات کا اب تک میں ذکر کر چکا ہوں یعنی جمعیت اہل حدیث' جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی' ان کے کرنے کا اصل کام اصلاحی' تبلیغی اور تعلیمی ہے اور تینوں کو جمع کر لیجئے تو یہ دین کی تجدیدی مساعی ہیں۔ عقائد کی اصلاح' اوہام کی صفائی' بدعات و رسومات سے گلو خلاصی' لوگوں کو دین کا صحیح فہم دینا اور دین کا مکمل و جامع تصور پیش کرنے کا کام علمائے کرام جمعہ و جماعت اور دارالعلوموں کے ذریعے کر سکتے ہیں اور جماعت اسلامی

لٹریچر اور دیگر ذرائع ابلاغ استعمال کر کے یہ تجدیدی کام جاری رکھ سکتی ہے۔ ذرا غور کیجئے تو اس کام کا بالواسطہ اثر سیاست پر لازماً مرتب ہو گا۔ تجدیدی مساعی سے لوگوں میں دو خوبیاں پیدا ہوں گی۔ ایک مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کی قوت ارادی اور دوسرے دین کا فہم و شعور۔ یہ ارادہ پیدا ہو گا تو افراد قوم خود اس کھوج میں ہوں گے کہ دین کی تعلیم کیا ہے اور دین کا فہم و شعور ان میں یہ صلاحیت پیدا کرے گا کہ کھرے اور کھوٹے کو پہچان سکیں۔ ان دونوں خصائص کا پھیلاؤ جیسے جیسے بڑھے گا ویسے ویسے انتخابات پر بھی ان کے اثرات ظاہر ہوں گے۔ ووٹ مانگنے والا اپنے آپ کو لامحالہ اسلام سے وابستہ کرے گا اور ووٹروں کی نظر بندی بھی نہ کر پائے گا کیونکہ وہ جانتے ہوں گے کہ اسلام کیا ہے 'کیا نہیں۔ گویا تجدیدی مساعی کرنے والے لوگ سیاست کے رخ کو باہر سے موڑیں گے۔ اگر وہ خود منجدھار میں کود پڑیں اور مدمقابل بن کر آ جائیں تو یہ کام نہ ہو گا اور ہوا تو مؤثر نہ ہو گا۔

دو سبق آموز واقعات

اب تک کی گفتگو میں دو کام گنوا چکا ہوں کہ اول سیاست کی گاڑی کو اپنے رخ پر چلنے دیا جائے اور یہ چلے گی ویسے ہی جیسے اس کی چال ہے۔ دوئم تجدیدی کام پر توانائیاں صرف کی جائیں جس کے اثرات سیاست پر خود بخود ظاہر ہوں گے۔ سیاست کی گاڑی کو مصنوعی بریک نہ لگایا جائے۔ لوگوں کی مذہبی حساسیت کو بھڑکا کر اس کے سامنے رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں۔ اس طرز عمل کی بہت سی مثالیں میں پاکستان کی گزشتہ تاریخ سے دے سکتا ہوں 'لیکن بات لمبی ہو جائے گی اور شاید بعض حضرات برا بھی مانیں۔ دوسرے کام کے سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی دو دن پہلے میں مانسہرہ سے آگے پہاڑوں میں "اگی" کے مقام پر تصوف کے سلسلے کے ایک بزرگ سید عبدالرؤف شاہ صاحب سے مل کر آیا ہوں۔ انہوں نے یہ بات سنائی اور میں اسے ریکارڈ پر لا رہا ہوں۔ ان کی ذاتی دوستی مفتی محمودؒ سے تھی۔ ایک ملاقات میں ان سے کہا کہ مفتی صاحب! جمعیت علمائے ہند ہندوستان میں جہاد حریت کر رہی تھی۔ انگریزی استعمار سے آزادی حاصل کرنی تھی۔ اب پاکستان بننے کے بعد آپ کا کیا کردار ہے؟۔ سیاست میں حصہ لینے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو اپنے اسلاف کے کام کی طرف پلٹنا چاہئے جو معاشرے کی دینی و اخلاقی اصلاح 'اس کا رخ اسلام کی طرف موڑنا اور پھر لوگوں میں دین کا فہم عام کرنا تھا۔ تو جواب میں مفتی صاحب مسکرا دیئے اور فرمایا کہ میرے بھائی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ گویا بات ہنس کے ٹال دی 'ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ایک اور واقعہ اس موقع پر میں تاریخ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا عذیر گل صاحب ماشاءاللہ ابھی بقید حیات اور مالاکنڈ کے علاقے میں مقیم ہیں۔ میں کئی سال پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اسلاف کی نشانی ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ جب مولانا مدنیؒ کے ساتھ مالٹا میں اسیر تھے تو تیسرے ساتھی یہی پرانے خادم 'مولانا عذیر گل تھے۔ جمعیت علمائے اسلام کے جس نوجوان عالم دین کی رہنمائی میں یہ سفر میں نے طے کیا تھا' اس نے واپسی پر سنایا کہ مولانا عذیر گل نے خود مولانا مفتی محمودؒ سے اپنی گفتگو کا ذکر اس سے کیا۔ مفتی صاحب مولانا کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ ہم نے ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے 'ہماری کامیابی کے لئے دعا فرمایئے۔ مولانا عذیر گل نے مولانا مفتی محمودؒ سے فرمایا کہ خیر دعا تو میں کر دوں گا لیکن اس راستے سے اسلام کبھی نہ آئے گا۔ اسلام آیا تو اسی انقلابی راستے سے آئے گا جو حضرت شیخ الہندؒ کا تھا۔ یہی بات میں کہتا چلا آ رہا ہوں۔ یہ کوئی ضدم ضدا نہیں۔ ۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدگی ہوئی تو اسی بنیاد پر ہوئی تھی کہ الیکشن کے طریق کار میں وقت اور صلاحیت برباد نہ کیجئے۔ یہ راستہ آپ کو کہیں نہ پہنچائے گا۔ اسے چھوڑ کر وہی کام اختیار کیجئے جو تقسیم سے پہلے کر رہے تھے۔

اعلیٰ ترین کام۔ انقلابی جدوجہد

کرنے کا تیسرا اور اعلیٰ ترین کام انقلابی جدوجہد ہے۔ اس انقلابی کام کا جذبہ جمعیت علمائے اسلام میں بھی پایا تو جاتا ہے 'مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کی تقاریر میں انقلاب کا ذکر بھی ضرور آتا ہے لیکن آخر میں پرنالہ آکر گرتا ہے تو انتخاب پر۔ ان لوگوں میں انقلابی

> میری دانست میں اسلامی انقلاب کے لئے جتنا جذبہ اور استعداد جماعت اسلامی میں موجود ہے 'اور کسی جماعت میں نہیں۔

جذبہ موجود ہے لیکن انتخابی میدان میں سرگرداں ہو کر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں جذبہ اور استعداد دونوں کے اعتبار سے جماعت اسلامی سرفہرست ہے۔ جماعت سے میری دلچسپی کا معاملہ صرف اس لئے نہیں کہ کبھی میں اس میں شامل تھا' دراصل میری دانست میں اسلامی انقلاب کے لئے جتنا جذبہ اور استعداد جماعت اسلامی میں موجود ہے 'اور کسی جماعت میں نہیں۔ اور وہ اس لئے کہ قدیم اور جدید کا جیسا امتزاج ان میں پایا

جاتا ہے۔ اور کہیں نہیں۔ میرے نزدیک مولانا مودودی مرحوم و مغفور علامہ اقبال مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم دونوں کے فکر کے جانشین تھے۔ علوم جدیدہ پر اسلام کی تنقید کا حق علامہ اقبال نے ادا کیا تو قرآن کی طرف دعوت اور جہاد کا علم مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک بلند کیا۔ مولانا مودودی دونوں کے جانشین تھے اور اس اعتبار سے ان میں جامعیت تھی اور آج میں یہ بھی بتادوں کہ مولانا کی تربیت میں جمعیت علمائے ہند کے اکابرین نے بھی حصہ لیا تھا۔ بالکل نوجوانی کے دور میں وہ "الجمعیت" کے ایڈیٹر رہے' جہاں انہیں حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد قریبی ساتھیوں 'مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعیدؒ سے قرب حاصل تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کو اسلامی انقلاب کے فکری پہلوؤں پر بڑی جامعیت عطا کی تھی۔ انہوں نے دین کا ایک جامع تصور دیا جو اگرچہ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی موجود ہے اور جذبہ بیدار کرتا ہے لیکن پوری طرح مربوط نہ تھا۔ مولانا نے اسے اپنی کتابوں کے ذریعے ایک مربوط نظام کی شکل دی۔ فرائض دینی کا تصور دیا اور بتایا کہ عبادت صرف نماز روزہ نہیں' پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کا نام ہے۔ اور یہ کہ امت کا فرض منصبی دین کی شہادت اور دین کو عملاً پیش کرنا ہے۔ جب تک امت یہ کام کرتی رہی' اللہ کی رحمت سے نوازی جاتی رہی۔ جب سے یہ کام چھوڑا ہے' عذاب الٰہی کی گرفت میں ہے۔

مولانا مودودی نے دلائل و شواہد کے ساتھ بتایا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ لوگوں پر دین کی قولی اور عملی گواہی کا کام پھر سے شروع کریں۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے حق کی حجت قائم کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک اسلام کا نظام قائم نہ کیا جائے' اس وقت تک ساری زبانی کلامی تبلیغ بیکار ہے۔ اسی کا نام اقامت دین ہے اور اسی تصور

> اس انقلابیت کے کچھ مظاہر آپ کو دکھاتا ہوں جو قبل از تقسیم جماعت اسلامی میں موجود تھی۔

کی بنیاد پر ایک ٹھیٹھ اسلامی انقلابی جماعت وجود میں آئی تھی جس میں ہر مسلمان کو شمولیت کی دعوت نہ تھی' وہی آسکتا تھا جو اسلام پر عمل کرنے اور اپنی زندگی پر اسے نافذ کرنے کا فیصلہ کر کے آئے۔ اس انقلابیت کے کچھ مظاہر آپ کو دکھاتا ہوں جو قبل از تقسیم جماعت اسلامی میں موجود تھی۔ انقلابی جماعتوں کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ داخلہ کی سخت شرائط' تحریک پاکستان سے علیحدگی' فلسطین کے مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا تھا اس سے بھی بے اعتنائی کہ

وہ تو اس جرم کی سزا تھا جس کا ارتکاب شہادت حق کا فریضہ ترک کر کے امت نے کیا اور ۱۹۴۶ء کے الیکشن سے لاتعلقی جو پاکستان کے لئے ریفرنڈم کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن بہرحال چند سو آدمیوں پر مشتمل ایک قافلہ ضرور وجود میں آگیا تھا' جس کا نقشہ میں نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ" میں کھینچا ہے۔ کتنے عظیم تھے یہ لوگ۔ کچھ لوگوں نے تو چند سال پہلے افغانستان کی طرف ہجرت کی تھی' ان لوگوں نے اپنے ملک میں رہتے ہوئے ہجرت کی۔ حرام کاروبار چھوڑ دیئے اور انگریز کی ملازمتوں پر لات مار دی کہ انگریز طاغوت ہے اور اس کے ساتھ تعاون دین کی حکمت کے منافی ہے۔

مولانا عذیر گل نے مولانا مفتی محمودؒ سے فرمایا کہ خیر دعا تو میں کر دوں گا لیکن اس راستے سے اسلام کبھی نہ آئے گا۔ اسلام آیا تو اسی انقلابی راستے سے آئے گا جو حضرت شیخ الہندؒ کا تھا۔

جماعت کا صحیح اور غلط کام

جماعت اسلامی ایک نہایت منظم جماعت تھی۔ آزادی کے بعد اس نے دو کام کئے۔ ایک بالکل درست اور بدقسمتی سے دوسرا ویسا ہی غلط۔ اس نے بروقت مطالبہ کیا کہ پاکستان میں دستور اسلامی ہونا چاہئے۔ اس مطالبے' مسلم لیگ میں اسلامی ذہن رکھنے والوں کی موجودگی اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی اسمبلی میں نشست نے یہ کام دکھایا کہ قرارداد مقاصد پاس ہوگئی۔ اس مطالبہ کو جاری رکھا جاتا تو دستور میں رفتہ رفتہ اسلام کا غلبہ ہوتا جاتا۔ لیکن دوسرے غلط کام نے اس کی اپیل محدود کر دی۔ وہ غلط کام انتخابی میدان میں چھلانگ لگا دینا تھا۔ یوں وہ خود ایک فریق بن گئی اور اسلام متنازعہ مسئلہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اب ایک سنہرا موقع میسر آیا تھا۔ میں نے الیکشن سے پہلے اپنے خطابات عام کے ذریعے اور قاضی حسین احمد صاحب' پروفیسر غفور احمد اور محمود اعظم فاروقی جیسے اکابرین سے گفتگو میں جماعت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ خدا کے لئے آپ الیکشن کے اکھاڑے سے باہر نکل آئیں۔ اس سے آپ کو عوام کی زبردست خیرسگالی حاصل ہوگی کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دینی جماعتوں کا باہمی تصادم ہی ان کی ناکامی کا سبب ہوتا ہے۔ ان کے دل دکھے ہوئے ہیں۔ آپ اگر نکل آئے تو ان کی ڈھارس بندھے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جو مذہبی اور دینی حلقے الیکشن میں حصہ لے

رہے ہوں گے' وہ آپ کے قریب آئیں گے تاکہ آپ کے حلقے کے ووٹ انہیں مل سکیں۔ یوں مخالفت کی بجائے موافقت اور مقابلے کی بجائے رجوع ہو گا۔ لیکن بہرحال میرا مشورہ قبول نہ کیا گیا تو دیکھئے کہ جماعت از کجا تا بہ کجا پہنچی ہے۔

انتخابی کامیابی کا موازنہ

موازنہ کے لئے جماعت اسلامی کے انتخابی میدان میں اترنے کے تین نقشے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں حصہ لیا گیا تو میں بھی ایک کارکن تھا۔ میں نے بھی ماڈل ٹاؤن میں مولانا امین احسن اصلاحی کے لئے کام کیا جو جماعت اسلامی کے ٹکٹ ہولڈر

میں نے بھی ماڈل ٹاؤن میں مولانا امین احسن اصلاحی کے لئے کام کیا جو جماعت اسلامی کے ٹکٹ ہولڈر نہیں' اسلامی انتخابی پنچایت کے نمائندے تھے۔

نہیں' اسلامی انتخابی پنچایت کے نمائندے تھے۔ اس کے لئے ایک اعلیٰ نظام وضع کیا گیا تھا۔ امیدواری حرام تھی اور پارٹی ٹکٹ ایک لعنت۔ پنچایتیں بنا کر لوگوں کو منتخب کیا اور مجبور کیا گیا کہ ہماری طرف سے الیکشن لڑو۔ امیدوار کو خود کچھ خرچ نہ کرنا تھا' اس پر تو ذمہ داری کا بوجھ آ رہا تھا لہٰذا سارا خرچ پنچایت نے کیا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس سیٹوں کی امید میں سے ایک بھی ہاتھ نہ آئی کیونکہ دھن' دھونس' دھاندلی کا کھلا استعمال ہوا جو مولانا مودودی ہی کی وضع کردہ ایک خوبصورت اصطلاح تھی۔ لیکن معاشرے کا چلن یہی تھا۔ محض مولانا محی الدین لکھوی منتخب ہوئے اور وہ بھی اس لئے کہ ان کے حلقے میں کئی گاؤں اہل حدیث حضرات کے تھے جن پر ان کا اثر گہرا تھا۔ کہا گیا کہ ہم کامیاب رہے کیونکہ ہم اپنے اصولوں کے پابند رہے لیکن اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں امیدواری بھی جائز ہو گئی اور پارٹی ٹکٹ بھی رحمت بن گیا۔ باقی بھی بساط بھر سب کچھ ہوا۔ جب حرام چیزیں حلال ہو گئیں تو معاشرے میں مروج دوسری باتیں بھی جو حرام و حلال کے مابین تھیں' اختیار کر لی گئیں لیکن نتیجہ کیا ہوا؟۔ پورے ملک سے چار جمع ایک ر پانچ سیٹیں ملیں۔ چار جماعت کے اپنے امیدوار جو سب اراکین تھے اور ایک مولانا ظفر احمد انصاری جنہیں جماعت کی حمایت حاصل تھی۔ اب اٹھارہ برس بعد کا نتیجہ دیکھئے۔ انیس (۱۹) اور اٹھارہ (۱۸) کل سینتیس (۳۷) برس کچھ کم وقت نہیں۔ نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں۔ ۱۹۸۸ء میں اصول تو خیر سب چھوڑ ہی دیئے گئے' اپنی

جماعتی حیثیت بھی باقی نہ رہی۔ جماعت کے ٹکٹ پر نہیں 'اتحاد میں جماعت کے کوٹے پر پانچ آدمی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ چھ کا دعویٰ کیا گیا لیکن ایک صاحب (خواجہ کمال) نے بیان دے دیا ہے کہ ان کا تعلق جمعیت علمائے اسلام (درخواستی گروپ) سے ہے۔

انتخابی معرکے کے اس نتیجے کے ساتھ کچھ اور تلخیاں بھی ہیں۔ قائدین میں سے ایک بھی نہ آسکا۔ پانچ غیر معروف آدمیوں میں سے تین ہی جماعت کے رکن ہیں اور ملکی سطح کا کوئی ایک بھی نہیں۔ جماعت کا پہلا قلعہ کراچی بنا' وہ پہلے ہی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ دوسرا مورچہ لاہور قرار پایا تھا۔ جہاں سے پچھلے الیکشن میں سید اسعد گیلانی 'لیاقت بلوچ اور حافظ سلمان بٹ آئے تھے۔ یہاں سے اب ایک رہ گئے جو جماعت کے رکن نہیں۔ کچھ ملا ہے تو ملک کے بالائی حصے میں' جیسے گرم ہوا اوپر کو اٹھتی ہے۔ اللہ رحم کرے کراچی سے اٹھتی یہ وہاں تک جا پہنچی ہے۔ تو یہ ہے چالیس سال کی محنت کا حاصل!

خود احتسابی کا وقت ہے

یہ خود احتسابی کا وقت ہے۔ جماعت کے لوگ اپنا اور اپنی قیادت کا احتساب نہیں کریں گے تو گاڑی اسی ڈگر پر چلتی رہے گی۔ تحریکیں اسی طرح بوڑھی ہو کر دم توڑ دیتی ہیں ورنہ

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

جماعت سے میری دلچسپی ہے تو اس لئے کہ ابھی وہاں مواد ہے۔ وہ نوجوان موجود ہیں جنہوں نے دین کے جامع تصور کو شعوری طور پر اختیار کیا ہے 'اقامت دین کو اپنا فرض سمجھا ہے اور جو اس کے مختلف تقاضوں کے لئے قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن ایک غلط حکمت عملی سے وہ قوت غیر مؤثر ہو رہی ہے اور پورا مواد صحیح نتائج پیدا نہیں کر رہا۔ قاضی حسین احمد صاحب سے ایک امید قائم ہوئی تھی 'لیکن افسوس کہ انہوں نے بہت مایوس کیا۔ اس سارے جوڑ توڑ کے دوران جماعت اسلامی کے ایک اہم رکن کی روایت کے مطابق وہ کئی گھنٹے نواز شریف صاحب کے ہاں جمے بیٹھے رہے کہ جب تک میرے امیدواروں کا فیصلہ نہیں کریں گے' یہاں سے اٹھوں گا نہیں۔ بار بار انہوں نے اشارے کئے کہ کر لیں گے' بس اب اٹھئے۔

لیکن نہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان جو پوری دنیا میں ایک معروف قوت ہے اس کا امیر اور اس کا یہ حال ہو تو مجھے آج بھی اس سے دکھ ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ دوبارہ غور کریں۔ اس انتخابی اکھاڑے سے نکلیں۔ اپنے انقلابی رخ کو اختیار کریں اور وہ قوت پیدا کریں کہ پھر جب میدان میں آکر چیلنج دیں تو جو صورت حال پیدا ہو' اسے سنبھال بھی سکیں جیسا کچھ تھوڑا بہت نقشہ ایران میں جما۔ اگرچہ وہ بھی کسی ایک جماعت کی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھا۔ اگر ایک جماعت کی جدوجہد ہوتی تو کئی گنا بہتر نتائج نکلتے اور استحکام پیدا ہوتا۔ وہ بھی ایک متحدہ محاذ تھا' ہماری نظام مصطفیٰ تحریک کا سا متحدہ محاذ۔ لیکن بہرحال مظاہرے کی قوت کے ذریعے ایک انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کے لئے ضروری قوت پہلے فراہم ہو چکی ہو۔

اس انقلابی کام کے لئے سب سے موزوں مواد جماعت اسلامی کے پاس ہے اور میری دلچسپی کی بس یہی وجہ ہے ورنہ میں بھی اسے بس ایک سیاسی جماعت سمجھوں تو کوئی بات نہیں۔ فتح و شکست سیاست کے میدان میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں ع کہ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ اب نہیں تو پانچ سال بعد سہی۔ سیاسی جماعتوں کے لئے یہ سارے الٹ پھیر معمولات کا حصہ ہیں۔ سو یہ تین باتیں میں نے کہیں۔ اول سیاست کی گاڑی کو چلنے دیا جائے۔ نئی حکومت کے پاس اگر عوام کے لئے کوئی مثبت پروگرام ہے تو قرار میسر ہو گا ورنہ ان کے پاؤں خود بخود اکھڑ جائیں گے۔ لیکن انہیں موقع تو دیجئے کہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔ دوئم اہل حدیث' جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی تجدیدی کام کریں اور سوئم انقلابی نہج پر اعلیٰ ترین کام کے لئے جماعت اسلامی کے پاس بہترین مواد ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو توفیق دے کہ میری باتوں پر خلوص سے اور خالی الذہن ہو کر غور کریں۔ ورنہ میری کوئی ذاتی یا گروہی غرض انہیں اس راستے پر ڈالنے میں نہیں۔

ضرورتِ رشتہ : تنظیم اسلامی سے وابستہ ۳۰ سالہ نوجوان انٹرڈ ڈپلومہ (الیکٹرونکس) ملازمت سپارکو۔ کراچی (تنخواہ ۔/۵۰۰ روپے ماہانہ) کو دینی مزاج کی حامل لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ رفقائے تنظیم کے گھرانے قابلِ ترجیح ہونگے۔
معرفت "میثاق" بکس ۱۰۱ ۔ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور پوسٹ کوڈ ۵۴۷۰۰

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت

داعیٔ انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تسوید - (شیخ) جمیل الرحمٰن

پیشِ کردہ یہ خطاب محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے آج سے پانچ سال قبل دسمبر ۱۹۸۳ء (مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۴ھ) میں کراچی بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیجیٹ ایجوکیشن کراچی کے ایک اجتماع میں ارشاد فرمایا تھا جس میں کراچی کے اکثر سیکنڈری اسکولز اور انٹر کالجز کے پرنسپل، ہیڈ ماسٹرز، اساتذہ اور لیکچرار زقریباً چھ سو کی تعداد میں شریک تھے چند دوسرے حضرات بھی تشریف لائے تھے۔ محبوب ربّ العالمین، سیّد المرسلین، خاتم النبیین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مطہّرہ کا تذکرۂ مبارک اور ڈاکٹر صاحب کا پُر تاثیر و فکر انگیز انداز اور اسلوبِ خطاب۔ پھر ایک بالکل نئے زاویہ سے سیرتِ مبارکہ کا بیان۔ ان تمام چیزوں نے مل کر پورے اجتماع کو مسحور کر رکھا تھا۔ شرکاءِ اجتماع گوش برآواز تھے اور ان کی نگاہیں خطیب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پورے اجتماع میں خطاب کے دوران ایک گھمبیر سی خاموشی چھائے رہی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جب اس تعذیب و تشدد، جور و ستم اور مصائب کا ذکر شروع کیا جو داعیٔ الی اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ

پر دعوتِ حق پیش اور قبول کرنے کی پاداش میں توڑے گئے تھے تو اس عاجز نے شرکاء کا جائزہ لیا تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو نمناک نظر نہ آئی ہو ۔ بھائی منصور احمد بُٹہ مرحوم و مغفور "مطالعۂ فطرت اور ایمان" نامی مشہور کتاب کے مؤلف اس عاجز کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ خطاب کے اختتام پر انہوں نے اس عاجز سے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ ایمان باللہ توحید کی یہ تشریح و تعبیر میرے سامنے پہلی مرتبہ آئی ہے اور آج پوری طرح واضح ہوا ہے کہ اسلام واقعتاً ایک انقلابی دین ہے ـــ مرحوم نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ اپنی زیرِ تالیف کتاب کی تیاری سے فارغ ہو کر وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس خطاب کو پاکستان کے کونے کونے میں اپنے ذاتی خرچ سے طبع کرا کے پھیلائیں گے۔ انہوں نے اس عاجز سے اپیل کے انداز میں فرمایا کہ میں اس خطاب کو جلد از جلد ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دوں اور کوشش کروں کہ محترم ڈاکٹر صاحب اس پر نظرِ ثانی فرمالیں۔ اسے عاجز نے رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ میں انجام دے لیا تھا لیکن اِدھر ڈاکٹر صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث اس پر نظرِ ثانی نہ فرما سکے اُدھر مارچ ۸۰ء میں بھائی منصور بٹہ کا قضائے الٰہی سے ہارٹ اٹیک کے باعث اچانک انتقال ہو گیا۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ۔ لہٰذا یہ خطاب محترم ڈاکٹر صاحب کی نظرِ ثانی کے انتظار میں پڑا رہا۔ لیکن موصوف کو تا حال اس کا موقع نہ مل سکا۔ اب یہ خطاب موصوف کی نظرِ ثانی کے بغیر قدرے حکّ و اضافے کے ساتھ ہدیۂ قارئینِ میثاق کیا جا رہا ہے۔ ماہنامہ میثاق میں اس کی تکمیل کے بعد اسے ان شاء اللہ العزیز کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام ہو گا اور توقع ہے کہ اللہ نے چاہا تو یہ خطاب "منہجِ انقلابِ نبوی" کے خلاصہ کا کام دے گا ـــ کسی خطاب کو تحریری شکل دینا کافی مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و توفیق ہی سے اس عاجز کے ہاتھوں یہ کام انجام پایا ہے۔ اس خطاب میں جو صواب ہے وہ من جانب اللہ ہے اور اگر کوئی خطا ہے، اظہارِ مدعا میں کوئی تقصیر ہے، ابہام ہے، بے ربطی ہے تو اس کی ذمہ داری اس عاجز کے

کاندھوں پر ہے جس کے لئے یہ عاجز بارگاہِ ربُّ العزت میں دست بدعا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج

احقر،
جمیل الرحمٰن عفی عنہ
یکم دسمبر ۱۹۸۸ء

●

الحمد للّٰه وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ افضلهم وخاتم النبیّین سید المرسلین محمدن الامین وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین ۔ امابعد فاعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم ط

يَآاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ٥ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ٥ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ٥

حضراتِ گرامی! ہر شخص جانتا ہے کہ سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا موضوع نہایت وسیع ہے، کثیر الاطراف ہے۔ اس کے متعدد پہلو ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں سیرتِ مطہّرہ ہمارے لئے مشعلِ راہ نہ ہو۔ بلا تشبیہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسے گلستان یا چمنستان کا تصور کیجئے جو لاتعداد انتہائی حسین وجمیل، انتہائی دلآویز، انتہائی دلکش و دلفریب اور انتہائی لطیف و مسحور کن خوشبوؤں سے لبریز و معطّر پھولوں سے لدا پھندا ہے۔ اور عالم یہ ہے کہ جیسے رنگ و بو کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ بایں صورتِ حال انسان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی ایک پھول کا انتخاب کرے۔ میں سیرت النبیؐ کی تقاریر میں متعدد بار اپنے اس تأثر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہّرہ کے مطالعہ سے میں مبہوت ہو جایا کرتا ہوں اور میرے قلب و ذہن پر نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مبارکہ اور قدسی شخصیت کا جو گہرا نقش و اثر ثبت اور قائم ہوتا ہے وہ حضورؐ کی اسی جامعیت کا ہوتا ہے کہ اتنی گمبھیر اور ہمہ گیر اور اتنی جامع زندگی تو ہمارے تصوّر اور حیطۂ خیال میں بھی آنی ممکن نہیں ۔ حضورؐ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اسوۂ حسنہ کے اعتبار سے اکمل و اتم نہ ہو۔

سیرتِ مطہرہؐ کے بے شمار پہلو

لیکن ظاہر ہے کہ کسی ایک تقریر یا مضمون کے لئے حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کا کوئی ایک پہلو، کوئی ایک گوشہ بطور عنوان و موضوع متعیّن کرنا ضروری ہے ورنہ بات مختلف گوشوں میں پھیلے گی اور ہو سکتا ہے کہ

اس طرح سیرتِ مطہرہ کا کوئی معین پیغام سامنے نہ آسکے۔ یقیناً آپ کے علم میں ہوگا کہ نبی اکرم صلی ا
علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دو کا ذکر بطور مثال پیش کرتا ہ
جنرل اکبر خاں نے ایک کتاب لکھی "حضورؐ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے"۔ ہمارے مشہور مفکر و محقق
ڈاکٹر حمید اللہ مدظلہٗ نے ایک نہایت مبسوط کتاب تحریر فرمائی "حضورؐ ایک سیاست دان کی حیثیت سے
مزید یہ کہ ہمارے صوفیاء کرامؒ اور اولیاءِ عظامؒ کے حلقوں میں حضورؐ کی سیرت بحیثیت "مُربّی و مزکّی" زیرِ
آئی اور اس موضوع کے اعتبار سے متعدد پہلوؤں پر بے شمار تصانیف منصّۂ شہود پر آئیں۔ اسی طرح
بہت سے مفکّرینِ اہلِ قلم نے "حضور بحیثیتِ داعی۔ بحیثیتِ مبلّغ۔ بحیثیتِ معلّم" وغیرہ کے موضوعا
پر نہایت اعلیٰ معیار کی کتابیں لکھیں۔ گویا مختلف لوگوں کا جو علمی ذوق اور طبیعت کا رجحان و میلان ہوگا
مناسبت سے سیرتِ مطہرہ کے بحرِ بے کنار اور لامتناہی گلستان سے اپنے اپنے دامن کی وسعت کے ا
سے اہلِ علم علم و حکمت اور اسوۂ حسنہ و کاملہ کے دُرِّ شہوار اور معطّر گل ہائے رنگا رنگ لے سکیں گے۔
مراد آبادی کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

حضور بحیثیت داعیٔ انقلاب: لہٰذا میں نے یہ طے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہ
پر "حضورؐ بحیثیت داعیٔ انقلاب" کے موضوع پر آج گفتگو کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چند اسباب
اس وقت دنیا میں "اسلامی انقلاب" کا لفظ کافی لکھنے اور بولنے میں آرہا ہے۔ ایران میں جو تبدیلی آئی
بلاشبہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے، اس نے ایک مرتبہ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پھر چونکہ ہمارے ا
بھائیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک خالص اسلامی انقلاب ہے تو یقیناً پوری دنیا کے مسلمانوں کو اس معا
غور کرنا چاہیئے اس لئے بھی کہ اس وقت شاید ہی مسلمانوں کا کوئی ملک ہو جہاں اسلامی نظام برپا کرنے
تحریکیں برسرِ کار نہ ہوں یا یہ جذبہ اور عزم موجود نہ ہو۔ الغرض گذشتہ نصف صدی سے مختلف مسلم
ممالک میں جو تحریکیں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے لئے چل رہی ہیں، ان میں سب سے بڑا BREAK
(THROUGH ایران میں ہوا ہے لہٰذا نتیجۃً اور فطرتاً توجہات اس طرف مرتکز ہوئی ہیں اور یہ انقلا
بہت زیادہ زیرِ بحث چلا آرہا ہے۔ اس کی موافقت میں بھی بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اور مخالفت میں
اس وقت انقلابِ ایران میرا موضوع نہیں ہے البتہ اگر ہمارے پاس ایک پیمانہ ہو، ایک معیار ہو
کسوٹی ہو تو پھر اس کے حوالہ سے ہم خود ASSESS کر سکیں گے، خود جانچ سکیں گے کہ جس جگہ جو

ہے اس کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے!!

اس موضوع سے ہمارے ملک کا تعلق : پھر ہم سب جانتے ہیں کہ اس مسئلہ کا تعلق خود ہمارے ملک سے بھی ہے۔ اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ملک "اسلام" کے نام پہ قائم ہوا تھا۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص، سوائے اس کے جو انتہائی ڈھٹائی اور تعصب پہ آمادہ ہو گیا ہو، اس بات سے انکار کر سکے کہ اس ملک کے استحکام کے لئے حقیقی بنیاد "اسلام" ہی ہے۔ اور اس ملک کو متحد رکھنے والی شے "اسلام" ہی ہے ۔۔۔ لیکن یہ اسلام اب تک یہاں کیوں نہیں آیا! اور آئے گا تو کیسے آئے گا! یہ مسائل ہیں جو ہمارے غور و فکر کے مستحق ہیں۔ کیوں نہیں آیا! میں اس وقت اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کروں گا چونکہ اس کے ڈانڈے عملی سیاست سے مل جائیں گے کہ کس کا کتنا قصور ہے! کسی کی کتنی کوتاہی ہے! پھر یہ کہ یہ گفتگو آج کے موضوع سے غیر متعلق بھی ہے۔ البتہ ہمارے ملک میں اسلام کیسے آسکتا ہے! یہ مسئلہ کا مثبت پہلو ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک آج کے موضوع سے بھی ہے۔ چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں کوئی دو مسلمان بھی مختلف الرائے نہیں ہو سکتے کہ وہ آسکتا ہے تو اسی نہج اور طریقہ پر کہ جس پہ انقلاب برپا فرمایا تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۔۔۔ امام دار الہجرت صاحب موطا امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک نہایت ہی حکیمانہ قول نقل ہوا ہے کہ : لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا۔ " اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر اسی طور سے کہ جس طور سے پہلے حصہ کی ہوئی تھی" ۔۔۔ معلوم ہوا کہ ہمارا جو قرن اول ہے، جو دور اول ہے، جو صدر اول ہے اس میں جو تبدیلی آئی تھی اور جو عظیم، اکمل و اتم اور صالح انقلاب برپا ہوا تھا تو اس کے متعلق ہمیں امکانی حد تک معروضی (OBJECTIVELY) طور پر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ نہج، وہ طریقہ، وہ عمل (PROCESS) کیا تھا! جس کے نتیجہ میں یہ انقلاب رونما ہوا ۔۔۔ یہ ہیں وہ مختلف پہلو اور گوشے جن کے اعتبار سے آج کا موضوع بہت اہم ہے۔ [1]

---

[1] اس موضوع پر الحمد للہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے دس خطابات پر مشتمل کتاب "منہج انقلابِ نبویؐ" کے عنوان سے موجود ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اغیار کی نظروں میں مقام

اس سے قبل کہ میں نبی اکرمؐ کی سیرت "بحیثیت داعیٔ انقلاب" پیش کروں۔ تمہیداً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس بات کو صرف حُسنِ عقیدت پر محمول نہ کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انقلاب برپا فرمایا تھا، وہ نہ صرف عظیم ترین تھا بلکہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے اعتبار سے اکمل و اتم تھا۔ بلکہ ناقدانہ طور پر اس امر کا اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہیئے کہ کہیں یہ محض ہمارے حُسنِ عقیدت اور فرطِ محبت کا کرشمہ تو نہیں ہے یا دراصل یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت اور واقعہ ہے۔ میں اس ضمن میں اپنوں کے بجائے چند اغیار کے حوالے دینا چاہتا ہوں۔ چونکہ دنیا کی یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے، یہ مسلّمہ اصول ہے کہ: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَآءُ "اصل فضیلت وہ ہے جس کا اقرار دشمن کریں"۔ اس اعتبار سے دیکھئے کہ ایچ جی ویلز جس کا سائنٹیفک فکشن میں جو بلند مقام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس نے فکشن کے علاوہ پوری دنیا کی تاریخ پر بھی دو کتابیں لکھیں۔ دونوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ایک کتاب تھی SHORT HISTORY OF THE WORLD اور دوسری تھی CONCISE HISTORY OF THE WORLD یہ دوسری کتاب خاصی ضخیم تھی۔ تھی، اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اب اس کا جو نیا ایڈیشن آیا ہے تو اس میں پبلشرز نے کافی ردّوبدل کر دیا ہے چونکہ ایچ جی ویلز تو کبھی کا مر کھپ چکا۔ وہ اعتراض و احتجاج کرنے کے لئے موجود نہیں۔ لیکن اس کی جو اصلی کتاب تھی جواب بھی اکثر بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہے۔ اس میں اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے پر ایک CHAPTER لکھا ہے ـــــ پہلے تو یہ بات جان لیجئے کہ وہ حضورؐ کا عقیدت مند نہیں بلکہ دشمن تھا۔ اس نے حضورؐ کی نجی زندگی پر شدید حملے کئے ہیں۔ تعدّدِ ازدواج کی کڑوی گولی مغرب کے حلق سے نہیں اتر سکتی۔ اس لئے کہ عیسائیوں کی آئیڈیل شخصیتیں دو ہیں حضرت مسیح اور حضرت یحییٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام ـــ اور ان دونوں برگزیدہ شخصیتوں نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ لہٰذا عیسائیوں کے یہاں تصوّر یہ ہے کہ اصل روحانی زندگی تجرّد کی زندگی ہے۔ ایک شادی کرنا بھی ان کے نزدیک روحانی اعتبار سے ایک کم درجہ کا فعل ہے۔ روحانی مملکت کا وہ SECOND RATE CITIZEN ہے جس نے شادی کر لی۔ اور جس نے متعدد شادیاں کی ہوں چاہے اس کی دینی اعتبار سے کتنی ہی مصلحتیں اور حکمتیں کیوں نہ ہوں، یہ کڑوا گھونٹ ان کے حلق سے اترنے والا نہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ پر ایچ جی ویلز نے بڑے رکیک حملے کئے ہیں۔ میں اس کا ذکر نہ کرتا۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ لیکن میں نے اس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ

(ESTABLISH) ہو جائے۔ یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ حضورؐ کا معتقد نہیں بلکہ دشمن تھا۔ لیکن وہ اس بات کے آخر میں آتا ہے تو پہلے وہ قریباً پورا خطبۂ حجۃ الوداع نقل کرتا ہے اور پھر تسلیم کرتا ہے کہ یہ حقوقِ انسانی کا پہلا منشور ہے۔ اس کے الفاظ ہیں (THE FIRST CHARTER OF HUMAN RIGHTS) اس میں وہ لکھتا ہے:

"یہ تاریخِ انسانی کا پہلا عظیم انقلاب ہے جو برپا کیا ہے محمد نے (صلی اللہ علیہ وسلم)"

پھر وہ لکھتا ہے اور عیسائی ہوتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"جہاں تک انسانی حُرّیت (HUMAN FREEDOM) اخوت (FRATERNITY) اور مساوات (EQUALITY) کا تعلق ہے تو اس کے مواعظ (SERMONS) پہلے بھی بہت کہے گئے۔ مسیحؑ ناصری (JESUS OF NEZZARETH) کے یہاں بھی وعظ تو بہت ہیں لیکن یہ مانے بغیر چارا نہیں کہ ان تین اصولوں (حُرّیت۔ اخوت اور مساواتِ انسانی) پر مبنی فی الواقع ایک معاشرہ تاریخِ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل قائم کیا محمد نے (صلی اللہ علیہ وسلم)"

اسی طرح میں آپ کی توجہ ایم این رائے کی گواہی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ برِصغیر پاک و ہند میں جو قابلِ ذکر چند انقلابی پیدا ہوئے ہیں، ان میں ایم این رائے کا شمار چوٹی کے انقلابیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جو بڑی مشہور ہے اس کا نام ہے "THE HISTORICAL ROLE OF ISLAM" اس میں وہ تسلیم کرتا ہے کہ تاریخِ انسانی کے عظیم ترین انقلابی ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

آپ میں سے اکثر کے علم میں ہوگا کہ امریکہ میں مسٹر مائیکل ہارٹ کی ایک کتاب (THE HUNDRED) کے نام سے چند سال پہلے چھپی ہے۔ اس کے مصنف نے تاریخِ انسانی کی سو عظیم ترین شخصیتوں کا انتخاب کیا۔ پھر ان میں درجہ بندی (GRADATION) قائم کی — مشاہیرِ عالم پر کتابیں پہلے بھی لکھی گئی ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسا کور چشم بھی گزرا ہو کہ جس نے حضورؐ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہو۔ لیکن ان کتابوں میں حضورؐ کا ایک عظیم شخصیت کی حیثیت سے تذکرہ ہوا ہوگا۔ پھر یہ کہ ایسی کتابوں میں جو تذکرہ ہوتا ہے وہ یا تو تاریخی اعتبار (CHRONOLOGICAL ORDER) سے ہوتا ہے یا حروفِ تہجی (ALPHABET ORDER) کے اعتبار سے — لیکن 'THE HUNDRED'، اس لحاظ سے منفرد اور مختلف کتاب ہے کہ اس میں جو ترتیب ہے وہ مصنف نے اپنے خیال کے مطابق عظمت کے اعتبار سے قائم کی ہے یعنی مصنف کے

نزدیک عظیم ترین شخصیتوں میں اوّلین کون ہے! دوسرے نمبر پر کون ہے! پھر تیسرے نمبر پر کون ہے! وقس علیٰ ہٰذا۔ اس میں نہ تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے نہ علاقہ اور مقام کا — وہ اپنی کتاب میں نمبر ایک پر لا رہا ہے جناب محمد کو (صلی اللہ علیہ وسلم) — غور کیجئے کہ کتاب چھپ رہی ہے مین ہیٹن (امریکہ) میں جو یہودیوں کا گڑھ ہے۔ پوری دنیا کی دولت کا بہت بڑا حصّہ وہاں مرتکز ہے۔ لکھنے والا ہے عیسائی۔ اس نے لکھا ہے کہ "میں نمبر ایک پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر کر رہا ہوں تو لازماً مجھے اس کی توجیہہ کرنے پڑے گی۔" اس کے الفاظ ہیں:

"NATURALLY I OWE AN EXPLANATION"

پھر اس نے ان الفاظ میں اس انتخاب کی توجیہ کی ہے کہ:

"HE IS THE ONLY PERSON SUPREMELY SUCCESSFUL IN BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR FIELDS"

"صرف وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) (تاریخ انسانی میں) واحد شخصیت ہیں جو مذہب اور سیکولر (لادینیت) دونوں میدانوں میں اعلیٰ ترین سطحوں پر کامیاب (ہوئے) ہیں۔"

فی الوقت صرف مغرب کے مفکّرین ہی کا نہیں بلکہ کرۂ ارضی کا مستقل ذہن یہ بن گیا ہے کہ وہ انسانی زندگی کو دو کھاتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک انفرادی۔ دوسرا اجتماعی — انفرادی کھاتے میں مذہب ہے، عقائد ہیں، مراسم عبودیت ہیں، چند معاشرتی رسوم (شادی بیاہ، پیدائش و فوتگی، وراثت وغیرہ) اور اخلاقیات ہیں۔ یہ گویا (PRIVATE AFFAIRS OF INDIVIDUALS) کا میدان (FIELD) ہے۔ اجتماعی کھاتے میں سیاست ہے، تمدّن ہے، قوانین ہیں، عدالت ہے، معیشت ہے، بین الاقوامی معاملات ہیں۔ الغرض پورا نظام حکومت ہے۔ یہ گویا اجتماعیت کا میدان (SECULAR FIELD) ہے۔ یہ ہے خدا ناآشنا مفکّرین کے غور و فکر کا حاصل اور نقطۂ نظر — اسی کے تحت عیسائی ہونے کے باوجود وہ حضرت مسیح علیہ السّلام کو نمبر دو پر لاتا ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "جتنی بھی عظیم ترین شخصیتیں ہیں ان کا معاملہ عجیب ہے کہ اِدھر RELIGIOUS FIELD میں کچھ عظمت ہے تو اُدھر SECULAR FIELD میں کچھ بھی نہیں۔ اِدھر بلندی پر ہیں تو اُدھر کہیں بھی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور مہاتما گوتم بدھ مذہب، اخلاق، عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت اونچی چوٹی پر لیکن سیاست، حکومت، تمدّن کے اعتبار سے زیرو (ZERO) — اُدھر سکندرِ اعظم، چنگیز، ہلاکو، اٹیلا

SECULAR FIELD میں بہت اعتبارات سے چوٹی پر لیکن RELIGIOUS FIELD میں بالکل تہی دامن بلکہ اس اعتبار سے انتہائی وحشی، ظالم اور غارت گر ـــــ جیسے علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

اِسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

آپ چاہیں تو ہٹلر کو بھی ان میں شامل کر لیجئے۔ اس نے ایک وقت تو پوری دنیا کو نچا کر رکھ دیا تھا۔ یہ سب اِدھر چوٹی پر نظر آتے ہیں تو اُدھر صرف زیرو ہی نہیں بلکہ MINUS VALUE دینی پڑتی ہے۔ اس تناظر میں وہ کہتا ہے کہ:

" انسانی تاریخ میں عظیم ترین شخصیت صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی ہے۔ جو SECULAR FIELD اور RELIGIOUS FIELD دونوں میں بیک وقت انتہائی کامیاب و کامران شخصیت ہیں۔"

ہم اس کی تعبیر یوں کریں گے کہ پوری انسانی زندگی میں ایک کُلّی، ہمہ جہتی تبدیلی اور ایک کامل اتم صالح انقلاب تاریخِ انسانی میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے برپا فرمایا ہے۔ کسی نے نئے عقائد دیئے، اخلاقیات کے وعظ اور درس دیئے لیکن وہ نئی تہذیب، نیا تمدن، نیا نظامِ اجتماعی نہیں دے پایا ـــ کسی نے نئی مملکت قائم کر دی، ملک پہ ملک فتح کر لئے لیکن وہ کوئی نئے عقائد، اعلیٰ اخلاق، نیا فکر نہیں دے پایا۔ یہ تمام چیزیں گھمبیر طور پر اور ایک کُل کی حیثیت سے اگر تاریخِ انسانی میں نظر آتی ہیں تو صرف انقلابِ محمدی میں نظر آتی ہیں۔ علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔

فلسفۂ انقلاب معلوم کرنے کا واحد ذریعہ

ایک بات اور بھی عرض کر دوں۔ وہ یہ کہ میرے نزدیک فلسفۂ انقلاب معلوم کرنے کا واحد ذریعہ صرف اور صرف سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ اگر کوئی سمجھنا چاہے کہ 'انقلاب' کسے کہتے ہیں اور اس کا منہجِ عمل کیا ہے! تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے پاس واحد موجود ذریعہ (THE ONLY AVAILABLE SOURCE) صرف اور صرف سیرتِ مطہرہ ہے[1]

[1] اس موضوع کی تفہیم کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف کی فکر انگیز کتاب "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کا مطالعہ فرمائیے

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ہوا ہے کہ ایک فردِ واحد نے کوئی دعوت شروع کی ہو، اس کی تبلیغ بھی خود ہی کی ہو، پھر اس دعوت کو قبول اور تسلیم کرنے والوں کو خود ہی منظم کیا ہو، ان کا تزکیہ اور ان کی تربیت بھی خود ہی کی ہو۔ پھر اپنی جمعیت کو پہلے سے قائم شدہ نظام سے خود ہی ٹکرایا بھی ہو۔ پھر اس ٹکراؤ اور تصادم میں ہر ہر قدم اور ہر ہر مرحلہ پر خود ہی قیادت بھی کی ہو اور نفسِ ایک وسیع و عریض خطۂ زمین پر ایک نظام کو بالکلیہ بدل کر رکھ دیا ہو۔

انقلابِ محمدیؐ کی جامعیت اور ہمہ گیری

پھر یہ تبدیلی اتنی ہمہ گیر اور جامع ہو کہ اس خطۂ زمین پر بسنے والوں کا صدیوں سے قائم شدہ نظامِ عقائد بدل گیا ہو۔ تین سو ساٹھ بتوں کو پوجنے والے ایک الٰہِ واحد کے بندے اور پرستار بن گئے ہوں۔ ان کی سوچ بدل گئی ہو، ان کا فکر بدل گیا ہو، ان کی اقدار بدل گئی ہوں، ان کا اخلاق بدل گیا ہو، ان کے عزائم بدل گئے ہوں، ان کے مقاصد بدل گئے ہوں، اُن کی آرزوئیں اور تمنائیں بدل گئی ہوں، ان کی معاشرت بدل گئی ہو، ان کے دن بدل گئے ہوں، ان کی راتیں بدل گئی ہوں، ان کی صبحیں بدل گئی ہوں، ان کی شامیں بدل گئی ہوں، ان کی زمین بدل گئی ہو، ان کا آسمان بدل گیا ہو، جو رہزن اور ڈاکو تھے وہ امن و سلامتی کے پیغام بر بن گئے ہوں، جو غارت گر تھے وہ لوگوں کی جان و مال کے محافظ بن گئے ہوں، جو زانی و شرابی تھے وہ عصمت و عفت کے نگران اور تقویٰ و طہارت کے پیکر بن گئے ہوں، جو شقی القلب اور کٹھور دل تھے وہ رؤف اور رحیم و شفیق بن گئے ہوں، جو اَن پڑھ اور اُمّی تھے وہ نئے نئے علوم و فنون کے موجد بن گئے ہوں۔ یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب اپنے مقصد کی تبلیغ اور دعوت کی توسیع و ترویج میں موت ان کو زندگی سے کہیں زیادہ عزیز و محبوب ہو گئی ہو۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

الغرض ڈھونڈے بھی کوئی ایسی چیز نہ مل سکے گی جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ یہ تبدیل ہونے سے رہ گئی ہو۔ ایسے ہمہ گیر، ہمہ جہت، مکمل و اتم اور جامع ترین۔ ساتھ ہی صالح ترین انقلاب کی دنیا میں کوئی دوسری مثال اور نظیر موجود ہی نہیں ہے۔

دنیا کے دوسرے دو بڑے انقلابات

اب دنیا کے دوسرے دو بڑے بڑے انقلابات کا جائزہ لیجئے۔ پہلا انقلاب فرانس ہے تو اس کے لئے فکر دینے والے والٹیر اور روسو جیسے بیسیوں مفکرین و مصنفین تھے۔ لیکن وہ صرف قلم کے دھنی تھے، میدان کے مرد نہیں تھے، لہٰذا ان کے دیئے ہوئے فکر پر انقلاب کا عمل از خود چلا ہے اور کافی طویل عرصہ تک چلا ہے۔ پھر جب وہ آیا ہے تو اس کی قیادت چند اوباش قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت خونین انقلاب تھا۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں صرف یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ ملوکیت کا دور ختم ہوا اور جمہوریت کے دور کا آغاز ہوا گویا نظامِ حکومت میں محض سیاسی پہلو کے اعتبار سے ایک تبدیلی آئی ـــــ دوسرا انقلاب روس ہے۔ اس انقلاب کی تاریخ عجیب ہے۔ فکر دینے والا کارل مارکس جو جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس نے اشتراکیت و اشتمالیت (COMMUNISM AND SOCIALISM) کا فلسفہ اولاً جرمنی میں پیش کیا اور بعدہٗ اسے انگلستان میں مدوّن کیا اور اپنا فکر اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ڈاس کیپٹل" (DASS-CAPITAL) کے ذریعے پیش کیا ـــ ان دونوں ممالک (جرمنی اور انگلینڈ) میں بالشویک اور کمیونسٹ انقلاب آج تک نہیں آیا ـــ اور مارکس صاحب اپنی زندگی میں ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہ کر سکے نہ کوئی انقلابی پارٹی تشکیل دے سکے۔ انقلاب آیا تو کہاں؟ روس میں۔ ایک فعال و متحرک شخصیت لینن نے مارکس کے فلسفہ کو ہاتھ میں لے کر انقلاب برپا کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں صرف معیشت کے ڈھانچہ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ تمام ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت سے نکل کر ریاست کی اجتماعی ملکیت میں چلے گئے اور مادّیت نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادّیت کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجۃً ایک جابرانہ اجتماعی نظام (TOTALITARIANISM) وجود میں آگیا۔

ـــ ان دونوں انقلابات کے متعلق یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ جس جمہوریت اور جس اشتراکیت کا نقشہ اور خاکہ اُن کے مفکرین نے پیش کیا تھا اس کے مطابق کہیں بھی ایک دن کے لئے بھی وہ نظام ہائے زندگی تا حال قائم و نافذ نہیں ہوئے۔ جمہوریت اور اشتراکیت کے نام سے جو نظام اس وقت رائج ہیں وہ اصل مفکرین کے پیش کردہ خاکوں اور نقشوں کی مسخ شدہ (PERVERTED) شکلیں ہیں۔

یہ انقلابات جزوی ہیں، معلوم ہوا کہ انقلابِ فرانس ہو یا انقلابِ روس ۔ وہ انقلاب اصل مفکرین کے نقشہ کے مطابق ایک دن بھی کہیں قائم و نافذ نہیں ہوا۔ پھر یہ کہ وہ کئی نسلوں (GENERATIONS) پر پھیلا ہوا عمل (PROCESS) ہے۔ مزید یہ کہ یہ انقلابات بھی جزوی ہیں۔ یعنی اجتماعی نظامِ زندگی میں کوئی تبدیلی اس کے سوا نہیں آئی کہ انقلابِ فرانس کے نتیجہ میں ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی اور انقلابِ روس کے نتیجہ میں انفرادی سرمایہ داری کے بجائے اجتماعی سرمایہ داری آگئی۔ رہا اجتماعی اخلاقیات کا معاملہ! اس شعبہ میں کوئی بہتر تبدیلی آنا تو درکنار، وہ روز بروز انحطاط و زوال سے دوچار ہوتا چلا گیا۔ جبکہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا معاملہ یہ ہے کہ ایک فردِ واحد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے دعوت شروع ہو کر کل بیس برس کی قلیل مدت میں ایک عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا جس کے نتیجہ میں سابقہ مشرکانہ و استحصالی نظام بیخ و بُن سے اکھڑ کر انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر ایک عادلانہ، منصفانہ اور صالح نظام قائم و نافذ ہو گیا ۔۔۔ لہٰذا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اگر کسی کو سمجھنا ہو کہ "انقلاب" کسے کہتے ہیں! اس کا منہجِ عمل (PROCESS) کیا ہے! اس کے مراحل و مدارج کیا ہیں! ان مراحل کے مختلف تقاضے اور لوازم کیا ہیں!! تو میں کسی فرطِ عقیدت اور فرطِ محبت کے بغیر یہ سمجھتا ہوں ۔۔۔ اور میرے نزدیک یہ سمجھنا خالص واقعیت پسندی ہے ۔۔۔ کہ اس کے لئے ہمارے پاس واحد AVAILABLE SOURCE صرف سیرتِ محمدی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

فلسفہ انقلاب اور اس کے مراتب و مدارج

آئیے اب ہم "انقلاب" کے فلسفہ اور اس کے مراحل، مدارج اور لوازم کو سیرت النبیؐ سے سمجھنے کی کوشش کریں ۔۔۔ کسی انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز (STARTING POINT) اور اس کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ ہو، کوئی انقلابی IDEOLOGY ہو، کوئی انقلابی فکر ہو اور وہ واقعی انقلابی ہو۔ انسانی زندگی کے جو تمدنی اور اجتماعی پہلو ہیں وہ رائج و نافذ الوقت نظام کی جن بنیادوں پر قائم ہوں، وہ انقلابی فکر واقعی اور حقیقی طور پر ان بنیادوں پر تیشہ بن کر پڑے اور ان کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے کے درپے ہو جائے۔ جب تک کوئی ایسا انقلابی فکر اور نظریہ نہیں ہوگا

انقلابی عمل شروع نہیں ہوسکے گا۔ وعظ (SERMON) سے نصیحت سے، نیکیوں کی تلقین سے انقلابی عمل شروع نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کچھ بہتر افراد (INDIVIDUALS) وجود میں آجائیں گے۔ معاشرہ میں دیانت و امانت کی اگر کوئی سطح موجود ہے تو وہ کچھ بلند ہو جائے گی۔ معاشرہ میں شرافت کی جو سطح موجود ہوگی وہ کچھ اونچی ہو جائے گی۔ نمازی کم تھے وہ کچھ بڑھ جائیں گے۔ ڈاڑھیوں والے کم تھے ان کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو جائے گا ــــ لیکن اس سے آگے بڑھ کر نظام کو بدلنا ہو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ انقلاب کا مطلب و مقصد اور اس کے معنی تو نظام کو بدلنے کے ہیں۔ محض تبلیغ و نصیحت سے اس کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوسکتی۔ انقلاب کے لئے لازمی اور ناگزیر ہے کہ اس کی دعوت کے ابتدائی نکات (INITIAL POINTS) رائج الوقت اجتماعی نظام کے اساسی معتقدات اور تعامل کی نفی پر مشتمل ہوں اور ان کے برعکس انقلابی تصورات کے حامل ہوں۔

دعوتِ محمدیؐ کا نقطۂ آغاز: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے آغاز میں جو اہم ترین چیز ہے وہ ہے انذارِ آخرت ۔ آخرت کی خبر۔ اس حقیقتِ کبریٰ کی خبر کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا ہے۔ اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ جیسے سورۃ المطففین میں فرمایا: اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۙ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (ترجمہ) "کیا یہ (لوگ) نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن (یعنی قیامت کے دن) یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جبکہ سب لوگ رب العلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (آیات: ۴-۶) ــــ پھر روزِ قیامت ہر ذی نفس کو اپنی پوری زندگی کے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا اور اس کے مطابق ہر انسان کے لئے عدالتِ خداوندی سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے، جیسے سورۃ الغاشیہ کے آخر میں فرمایا: اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَهُمْ ۙ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (ترجمہ) "ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے، پھر ان کا حساب لینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔" (آیات: ۲۵-۲۶) ــــ مکّی دور کی ابتدائی سورتوں میں اسلامی انقلاب کے تین اساسی و بنیادی نکات توحید، رسالت اور معاد یعنی آخرت میں سے آخرت کے انذار پر سب سے زیادہ زور (EMPHASIS) ملے گا۔

خطباتِ نبویؐ کی کتابوں میں ایک خطبہ ملتا ہے جو یقیناً اسی ابتدائی دور کا ہے۔ اس خطبہ کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَ بِالسُّوْءِ سُوْءً وَ اِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا ۔

(ترجمہ) "اللہ کی قسم تم سب مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سوجاتے ہو۔ پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہوجاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے ہمیشہ کے لئے"۔

سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات کے متعلق ہمارے متقدمین میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ پہلی وحی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، لیکن یہ رائے شاذ ہے۔ امت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلّم ہے کہ حضورؐ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ سے مَالَمْ یَعْلَمْ تک ہے اور یہ وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ اکثر مفسرین متقدمین کی رائے ہے جو کافی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہوا اور سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ رسالت پر فائز فرمائے گئے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَم۔ اس سورۂ مبارکہ کی دوسری اور تیسری آیات سے ہمارے موضوعِ زیرِ گفتگو کا گہرا تعلق ہے لہٰذا میں ان کی قدرے تفصیل سے تشریح و توضیح کروں گا۔ البتہ اسی موقع پر یہ بات جان لیجئے کہ ابتدائی ساتوں آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست خطاب ہے۔ پہلی آیت صرف خطاب پر مشتمل ہے: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ "اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے!" ـــ اس طرزِ خطاب سے یہ لطیف مفہوم نکلتا ہے کہ اے میرے محبوب بندے! تم لپٹ لپٹا کر لیٹ کیسے گئے! تم پر تو ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جانے والا ہے۔ جس کا ذکر سورۃ المزمّل میں۔ جو بعض مفسرین متقدمین کے نزدیک دوسری وحی ہے۔ بایں الفاظ فرمادیا گیا ہے: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ (آیت ۵)۔ (اے نبیؐ!) ہم تم پر ایک بھاری بات (بارگراں) ڈالنے والے ہیں"۔ ـــ اگلی چھ آیات آٹھ اوامر و ہدایات پر مشتمل ہیں جن کا کارِ رسالت سے لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔ دوسری اور تیسری آیت تین اوامر پر مشتمل ہے جن کا تعلق اُس قولِ ثقیل سے، اس بارِ گراں سے ہے جس کو سورۃ المزمّل میں بیان کر دیا گیا تھا۔ دوسری آیت میں اسلامی انقلاب کے

نکتۂ آغاز یعنی انذارِ آخرت کا حکم ہے اور تیسری آیت میں اس انقلابِ اسلامی کے منتہائے مقصود کو بیان کر دیا گیا ہے یعنی تکبیرِ ربّ۔ اللہ تعالیٰ کی تشریعی کبریائی کا بالفعل قیام و نفاذ۔

انقلابِ محمدیؐ کا فلسفہ اور منہاج

آیئے اب ان تین آیات کی روشنی میں بطریقِ تدبّر انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے فلسفہ اور منہجِ عمل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ حضورؐ سے خطاب ہوتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ "اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے!" قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ "اب اپنے منصبِ رسالت کی ادائیگی کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ کمر کس لو اور اپنی جدّوجہد کا آغاز کرو"۔ یہ پہلا موقع ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُٹھ کھڑے ہونے اور اُس شہر اور معاشرہ میں اپنا انقلابی مشن کی دعوت دینے کا حکم دیا جا رہا ہے جو شرک کا گڑھ ہی نہیں ہے بلکہ بیت اللہ شریف کے باعث مکّہ مکرمہ تمام مشرکین عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا ہے۔ اور قریش اس کے مجاور ہیں جس کی وجہ سے ان کو عرب کی مذہبی سیادت و قیادت بھی حاصل ہے اور جو ان کی معاش کا بھی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کعبہ شریف اور اس میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بتوں پر جو چڑھاوے چڑھتے تھے ظاہر بات ہے کہ وہ حسبِ مراتب خاندانِ قریش میں تقسیم ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ اسی بیت اللہ کے طفیل قریش کے تجارتی قافلے یمن سے شام اور شام سے یمن تک بے خوف و خطر آتے جاتے تھے جبکہ قریباً پورے عرب میں لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم رہتا تھا۔ دوسرے قبائل کے تجارتی قافلوں کا محفوظ طور پر اُس وقت تک گزر جانا ممکن نہ تھا جب تک ان کے ساتھ حفاظت کے لئے کافی بڑی تعداد میں مسلح نفری موجود نہ ہو۔ دریں حالات ایک شخص کا تن تنہا اٹھ کھڑے ہونا اور اسلام کی انقلابی دعوت دینا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن حکمِ الٰہی ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ کمربستہ ہو کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنے کام کا انذار سے آغاز کرو۔ آخرت کے فکر سے بے نیاز اور بے پروا لوگوں کو خبردار کرو۔ غفلت کے ماتوں کو جگاؤ۔ ان کو WARN کرو۔ ان کو آگاہ کرو کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ ایک یومِ عظیم آنا ہے جب تم کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور تمہیں محاسبہ اور جواب دہی کے لئے اپنے رب، اپنے خالق، اپنے مالک کے حضور میں کھڑے ہونا ہوگا۔

ایمانیات ثلاثہ کا باہمی ربط و تعلّق

اس آیت پر تدبّر کے نتیجہ میں یہ اصل الاصول مستنبط ہوا کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں اسلامی انقلاب کی دعوت کا نقطۂ آغاز انذارِ آخرت ہے۔ غور و فکر سے اس کی حکمت بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ دیکھئے ہمارے دین کے ایمانیاتِ ثلاثہ توحید۔ رسالت اور معاد یا آخرت جہاں باہم دگر مربوط اور ایک وحدت ہیں وہاں ان کے تقاضے اور مفاہیم میں بعض اعتبارات سے تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ نظری و علمی اعتبار سے اہم ترین ایمان "ایمان بالتوحید" ہے۔ قانونی و آئینی اعتبار سے اہم ترین ایمان "ایمان بالرسالت" ہے۔ انسان کو تقویٰ کی روش اختیار کرنے اور دین کے تقاضوں کے مطابق آمادۂ عمل کرنے کے اعتبار سے اہم ترین ایمان "ایمان بالمعاد" یا "ایمان بالآخرت" ہے۔ ایک شخص توحید کا قائل ہے لیکن جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا بالکلیہ منکر ہے یا اس کا مقرّ تو ہے لیکن ساتھ ہی آپؐ کے بعد سلسلۂ نبوت کے جاری رہنے کو تسلیم کرتا ہے تو وہ کسی حال میں بھی مسلم و مومن نہیں ہے۔ یا وہ ختم نبوّت کا بھی قائل ہے لیکن وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنتوں اور فرمودات کو دین میں حجت تسلیم نہیں کرتا اور آپؐ کو ہر زمان و مکان میں مطاع نہیں مانتا تو اس کا ایمان بھی غیر معتبر ہے۔ اسی طرح کوئی شخص دین کی ان تعلیمات کو تو بالکل صحیح طور پر تسلیم کرتا ہے۔ لیکن قیامت، آخرت، حساب کتاب، وزنِ اعمال اور جنّت و جہنّم کی قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ صحیحہ میں بیان کردہ حقائق اور امور کی من مانی اور اپنی ناقص عقل سے ایسی تعبیرات و تاویلات کرتا ہے جو کتاب و سنّت کے نصوص، منشاء اور مدّعا کے یکسر خلاف ہیں تو وہ بھی مسلم و مومن نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ مبارک قولِ فیصل کی اہمیت و حیثیت کا حامل ہے:۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

انذارِ آخرت کی اہمیت: میں عرض کر رہا تھا کہ اسلامی انقلاب کا نقطۂ آغاز (STARTING POINT) انذارِ آخرت ہے۔ تجدید دین اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ یعنی دین اللہ کو بحیثیت نظامِ حیات

غالب، قائم و نافذ کرنے کے لئے کوئی تحریک اٹھے لیکن وہ انذارِ آخرت پر وہ زور نہ دے جس کا تقاضا قرآن و حدیث اور سیرتِ مطہرہؐ کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آتا ہے تو وہ تحریک اور وہ دعوت منہاجِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام پر نہیں ہوگی۔ ایسی تحریک و دعوت منہاجِ نبوّت پر اس وقت تک قرار دیئے جانے کی مستحق نہ ہوگی جب تک اس کے پیشِ نظر کوئی دنیوی غرض نہ ہو۔ نہ اسے دنیا میں کسی صلہ اور اجر کی تمنّا ہو حتیٰ کہ اس کا مطلوب و مقصود دنیا میں حصولِ اقتدار بھی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ خاص سے اسے تمکّن فی الارض عطا فرمادے تو یہ اس کا انعام ہوگا۔ حصولِ اقتدار کو اگر نصب العین کا درجہ دیا گیا تو تمام اعمالِ صالحہ کے حبط ہونے کا اندیشہ بلکہ خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ کوئی تحریک و دعوت منہاجِ نبویؐ پر نہیں ہوگی جب تک اس کے آغاز میں اسلامی انقلاب کی دعوت کا اہم ترین نکتہ انذارِ آخرت نہ ہو۔ جب تک اس تحریک و دعوت کے وابستگان اور متوسّلین کا اصل نصب العین (MOTIVE) آخرت کی نجات، اُخروی فلاح اور رضائے الٰہی کا حصول نہ بن جائے۔ اور جب تک یہی امور تمام اعمالِ صالح اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے اصل جذبۂ محرکہ کا مقام حاصل نہ کرلیں۔ تب تک وہ صحیح معنوں میں اسلامی انقلابی تحریک نہیں کہی جاسکے گی۔ اس لئے کہ اسلامی انقلاب کے لئے مخلصانہ، حقیقی، پائیدار اور مستحکم جذبۂ عمل صرف رضائے الٰہی کے حصول اور نجاتِ اُخروی کو نصب العین بنانے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز کمزور ہوگی تو اللہ کی راہ میں سعی و محنت کرنے، جان و مال کھپانے، ایثار کرنے اور قربانیاں دینے کا جذبۂ صادق کہاں سے آئے گا۔! قوّتِ محرکہ (MOTIVATING FORCE) کیسے پیدا ہوگی!!

انقلاب کے کارکنوں کے لیے عظیم ترین محرک

آپ کو معلوم ہے کہ انقلابی تحریک میں حصّہ لینے والے کو تو ذہناً اس بات کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے کہ مجھے اس راہ میں اپنا سب کچھ لگانا اور کھپانا ہے، سب کچھ حتیٰ کہ جان بھی قربان کرنی ہے۔ ساتھ ہی وہ جانتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ انقلاب میری زندگی کے دوران نہ آئے۔ میں اپنی آنکھوں سے انقلاب کی کامیابی نہ دیکھ سکوں ــــ اکثر انقلابی لوگ اپنی زندگیاں دے دیتے ہیں کامیابی اگر ہوتی بھی ہے تو ان کے بعد ہوتی ہے۔ وہ تو گویا آئندہ نسل کی بھلائی اور ــــــــ

بہتری کے لئے انقلابی تحریک میں پورے جوش و خروش سے کام کر رہے ہوتے ہیں — لیکن غور کیجئے کہ کسی وقت بھی ان کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ ہم جو یہ مصیبتیں جھیل رہے ہیں تو آخر کس لئے اپنی زندگی میں ہمیں تو انقلاب کے کامیاب و کامران اور بار آور ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی! تو دنیوی طور پر اس انقلاب کے نتائج سے بہرہ مند نہیں ہوسکیں گے — ! یہ محض خیالی بات نہیں بلکہ خالص منطقی (PURE LOGICAL) تجزیہ ہے۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ یہ جو ایمان بالآخرۃ ہے یہ جو رضائے الٰہی اور اُخروی نجات کا نصب العین ہے، وہ ایک بندۂ مومن کو اس کی زندگی کے آخری سانس تک فعّال اور متحرک رکھتا ہے۔ چونکہ اس کا مطلوب و مقصود دنیا اور اس کے فوائد ہیں ہی نہیں اس کا اصل نصب العین آخرت ہے جس پر اسے پختہ ایمان و ایقان حاصل ہے اور وہ شعوری طور پر جانتا ہے کہ میری زندگی میں دنیا میں انقلاب آئے نہ آئے۔ انقلابی عمل کامیاب ہو یا ناکام۔ اس راہ میں اس نے جو سعی و محنت کی ہے، جو جان و مال لگایا ہے، جو صلاحیتیں اور توانائیاں کھپائی ہیں جو مصائب و شدائد برداشت کئے ہیں، جو قربانیاں دی ہیں، جو ایثار کیا ہے وہ سب کچھ ضائع جانے والے نہیں۔ ان سب کا اجر اس کے لئے آخرت میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان جان نثاروں اور فداکاروں کے لئے یہ نوید جانفزا موجود ہے :

أَنِّي لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّنۢ بَعْضٍ ۖ فَٱلَّذِينَ هَاجَرُوا۟ وَأُخْرِجُوا۟ مِن دِيَٰرِهِمْ وَأُوذُوا۟ فِى سَبِيلِى وَقَٰتَلُوا۟ وَقُتِلُوا۟ لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّـَٔاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ عِندَهُۥ حُسْنُ ٱلثَّوَابِ ○

"میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے میں ان سب کے قصور لازماً معاف کردوں گا اور انہیں لازماً ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اُن کی جزا ہے اللہ کے یہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔" (آلِ عمران : ۱۹۵)

اور بقول علامہ اقبالؒ ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

اسی بات کو اقبالؔ نے ایک دوسرے اسلوب سے یوں ادا کیا ہے، جس کو میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں:

ے شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

سیرت سے تین مثالیں: تفہیم کے لئے سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ـــــ غزوۂ بدر میں مشرکین کے ستر سربرآوردہ اشخاص مقتول ہوئے تھے جن میں امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا فرعون، اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل بھی واصلِ جہنم ہوا تھا۔ غزوۂ احد میں چند مسلمانوں کی اجتہادی غلطی کے سبب سے مسلمانوں کی ابتدائی فتح شکست سے بدل گئی تھی اور اس میں ستر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ لیکن اس جنگ میں قریش کے بھی چند ممتاز لوگ مقتول ہوئے تھے جن میں ایک نمایاں شخصیت حارث ابن عامر کی بھی تھی جن کو حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قتل کیا تھا۔ بایں وجہ مشرکینِ مکہ کے سینوں میں انتقام کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں۔ اس پس منظر میں دو قبیلوں کے چند لوگوں نے ۴ھ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قبیلوں کے اسلام قبول کرنے کا اقرار کر لیا اور درخواست پیش کی کہ قبیلے کے لوگوں کو اسلامی عقائد و احکام کی تعلیم کے لئے چند صحابہؓ کو ان کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ حضورؐ نے دس صحابہؓ ساتھ کر دیئے۔ مکہ اور مدینہ کے وسطی مقام رجیع میں ان غداروں نے بدعہدی کی اور بنولحیان کو جو اس علاقہ میں مقیم تھا خفیہ طور پر پیغام بھیج دیا کہ ان اصحابِ رسولؐ کا کام تمام کر دیں۔ دس افراد پر دو سو کے لشکر نے یلغار کر دی۔ ان لوگوں نے بڑھ کر ایک پہاڑی پر پناہ لی۔ حملہ آوروں نے امان کا وعدہ کر کے ان کو پہاڑی سے اترنے کی ترغیب دی لیکن سردارِ لشکر نے اس وعدہ پر اعتماد نہیں کیا۔ وہ اور ان کے سات ساتھی لڑ کر شہید ہو گئے۔ دو حضرات، حضرت خبیب اور حضرت زید ابن الدثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کافروں کے وعدہ پر اعتماد کر کے پہاڑی سے اتر آئے۔ کافروں نے بدعہدی کی اور ان کو باندھ کر مکہ لائے اور بیچ ڈالا۔ حضرت خبیبؓ کو حارث ابن عامر کے بیٹوں نے خرید لیا تاکہ باپ کے بدلہ میں ان کو قتل کریں۔ وہ ان کو حرم کی حدود سے باہر لے گئے۔ حضرت خبیبؓ نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت چاہی، قاتلوں نے اسے منظور کر لیا۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا "دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن خیال آیا کہ تم کو گمان ہوگا کہ موت کے ڈر سے طویل نماز پڑھ رہا ہوں"۔ پھر یہ اشعار پڑھے:

(ترجمہ) "جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں، تو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں کہ کس پہلو سے قتل کیا جاؤں گا۔ یہ جو کچھ ہے خالصۃً اللہ کے لئے ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل فرمائے گا۔"

دوسرے صحابی حضرت زید ابن الدثنہؓ کو قتل کے ارادہ سے صفوان ابن امیہ نے خریدا تھا۔ ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشہ دیکھنے آئے ـــــ حضرت زیدؓ کو ایک درخت سے باندھا ہوا ہے۔ اُنؓ کے خون سے اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے لوگ جمع ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں نیزہ ہے، کوئی تیر کمان لئے کھڑا ہے، کسی نے تلوار سونت رکھی ہے۔ سب کو اپنی اپنی آگ بجھانی ہے۔ اس موقع پر ایک سردار بولا "سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کئے جائیں تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے!" حضرت زیدؓ نے جواب میں کہا۔

"خدا کی قسم! میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک میں ایک کانٹا چبھ جائے۔"

اس مکالمہ کے بعد ایک شقی آگے بڑھا اُنؓ کے جگر میں نیزہ کی اَنی کا ایک کچوکا دیا۔ جب یہ پہلا کچوکا لگا تو حضرت زیدؓ کی زبان سے الفاظ نکلے:

فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ

"رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا"

غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں کی فتح شکست و ہزیمت میں بدل گئی تھی، گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی تو اس موقع پر ایک نوخیز جوان صحابیؓ ایک طرف کھڑے کھجوریں کھا رہے تھے۔ وہ کھجوریں کھاتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور آپؐ سے دریافت کیا کہ "اگر میں اس جنگ میں مارا جاؤں تو آخرت میں مجھے اس کا کیا صلہ اور کیا بدلہ ملے گا!" حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا "جنت"۔ ان نوجوان صحابیؓ نے ہاتھ سے کھجوریں پھینکیں کہ ان کو مزید کھانے میں جو وقت لگے گا وہ دخولِ جنت میں حارج کیوں ہو! اور دیوانہ وار گھمسان کے معرکۂ جنگ میں گھس گئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر لیا ـــــ یہ جذبہ صرف اور صرف ایمان بالآخرۃ دے سکتا ہے۔ دنیا میں کوئی اور شے ایسی نہیں ہے جو اس درجہ کا انسان کو جذبہ دے سکے۔ (جاری ہے)

آخرت پر ایمان (آخری قسط)

محمد غوری صدیقی

آخرت کا آخری مرحلہ

اللہ کی عدالت میں پیشی اور حساب کتاب کے بعد تمام انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ جنتی ہو گا۔ دوسرا گروہ جہنمی ہو گا۔ آخرت کا انسانی معاشرہ دو علاقوں یا دو جہانوں پر مشتمل ہو گا ایک جہان کا نام جنت ہو گا۔ دوسرے جہاں کا نام جہنم ہو گا۔

جنت میں آرام بغیر کام کے 'لذت و راحت بغیر مشقت کے حاصل ہوں گی۔ جنت کا نظام اس قدر اعلیٰ وارفع اور تیز تر ہو گا کہ جنت کے شہری کی خواہش ہی جنت کے نازک نظام کو حرکت میں لا کر فوراً مطلوبہ شے مہیا کر دے گی۔ روایات میں آیا ہے کہ جنتی کی خواہش پر درختوں کے پھل خود جھک کر خود کو پیش کر دیں گے۔ جنتی دیکھے گا کہ خوش نما خوش آواز پرندے اڑے جا رہے ہیں۔ ان پرندوں کے کباب کی خواہش دل میں پیدا ہو گی اور دوسرے ہی لمحے ان کے کباب تھال میں سج کر پیش ہو جائیں گے۔ گویا ہر خواہش پوری ہونے کی جگہ جنت ہی ہے۔ یعنی کن فیکون کی طاقت دے دی جائے گی۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (سورۂ حٰم سجدہ)

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

جنت میں زندگی نہایت پاکیزہ اور صاف ستھری ہو گی۔ وہاں گندے' بدتمیز' بدکار' بداخلاق' ناشائستہ اور غیر مہذب انسانوں کو داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ "لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا" "وہ (جنتی) وہاں نہ لغو نہ جھوٹی بات سنیں

گے" جنت کی شہریت ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کے اخلاق پسندیدہ 'گفتگو شیریں' کردار دلکش و مضبوط' جن کی چال' ڈھال میں ایک شان ہو۔ ذوقِ نظر شستہ و پاکیزہ ہو۔ جن کی طبیعت حق و صداقت' محبت و مروت' فیاضی و ایثار' شرم و حیا غیرت و حمیت' امانت و دیانت' رحم و کرم' نظم و ضبط' اور عدل و انصاف سے لبریز ہوگی۔ وہ لوگ جنت کے فردوسی معاشرہ کے معیار پر پورے نہیں اتریں گے جو بد ذوق' بد نظر' بد اخلاق' بے سلیقہ' آوارہ مزاج' بے لگام ہوں گے۔ جن کے دل ہوا و ہوس سے گندے' جن کے دامن گناہوں سے ناپاک ہوں گے۔ ایسے بزدل کہ نفس کے شیطان سے نہ لڑ سکے۔ ایسے سنگدل کہ مظلوموں اور بے کسوں پر رحم کھانے کی بجائے ستم ڈھاتے رہے۔ وہ کہ جنہوں نے ہر باطل اور طاغوت کے آگے سر جھکایا اور حق و صداقت کے ہر مطالبہ کو ٹھکرایا۔ نفرت و عداوت' بغض و حسد' ظلم و ستم' حرص و طمع' بزدلی و منافقت کی گندگیوں میں پروان چڑھے ایسے گندے' بے حمیت اور بودے کردار کے لوگوں کو جنت میں داخلہ نہ مل سکے گا۔ ان کو جہنم کے علاقے میں داخل کر دیا جائے گا۔ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ○ یَصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ "۔

دوزخ

حضورؐ نے فرمایا کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب اس شخص پر ہو گا جس کی دونوں جوتیاں اور تسمے آگ کے ہوں گے جس کی وجہ سے ہانڈی کی طرح اس کا بھیجہ کھولے گا۔ وہ سمجھے گا کہ سب سے زیادہ عذاب مجھے ہی ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ سے ۷۰ گنا سخت ہوگی۔ ایک روایت میں ہے کہ اگر دوزخی دنیا کی آگ میں آ جائیں تو ان کو نیند آ جائے۔ فرمایا دوزخ میں ایک پتھر ڈالا جائے تو تہہ تک ۷۰ سال میں پہنچے گا۔

اہل دوزخ کے جسم بہت چوڑے چکلے بنا دیئے جائیں گے تا کہ عذاب کی سختی زیادہ محسوس ہو۔ زخموں کا دھوون' خون' پیپ' کھولتا پانی ان کا شربت ہو گا اور کانٹے دار جھاڑیاں (ضریع) ان کا کھانا ہو گا۔ جن کو کھانے سے بھوک نہ مٹے گی سورۂ مومنون میں ہے۔ "آگ ان کے چہروں کو جھلستی ہوگی اور اس میں ان کے منہ بگڑے ہوں گے"۔

حضورؐ نے فرمایا کہ "اے لوگو! روؤ اور رونہ سکو تو رونے کی صورت بناؤ کیونکہ دوزخ میں دوزخی اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسو ان کے چہرے پر نالیاں بنا دیں گے۔ روتے روتے آنسو

نکلنے بند ہو جائیں گے تو خون بہنے لگے گا جس کی وجہ سے آنکھیں زخمی ہو جائیں گی۔ خون اور آنسو اتنا نکلے گا کہ اگر اس میں کشتی چھوڑی جائے تو وہ چلنے لگے۔" (شرح السنّہ)

جنت

ایک حدیث میں (مسلم شریف کی) ہے کہ ادنیٰ درجہ کے جنتی کو جنت میں جو رقبہ دیا جائے گا وہ تمام دنیا سے دس گنا بڑا ہو گا ایک خدا سے ڈرنے والے کو دو دو باغ اتنے بڑے بڑے ملیں گے جن کی لمبائی چوڑائی اتنی ہو گی کہ مسافت میں سو برس لگیں۔ (جواہر التفسیر)

ہر مومن کے لئے جنت میں ایک موتی کا خیمہ ملے گا جس کی لمبائی ۶۰ میل کی ہو گی اور اس خیمہ میں اس کی بیویاں اس طرح قیام کریں گی کہ ایک دوسری کو نہ دیکھ سکیں۔ (مسلم شریف)

جنت والے اپنے اوپر والوں کو بلندی کے باعث اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم آسمان پر ستارے دیکھتے ہو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی ہو گی۔ کنکریاں موتیوں اور یاقوت کی ہیں اس کی مٹی زعفران کی بنی ہوئی زرد اور خوشبودار ہو گی جو کوئی اس میں داخل ہو گا چین و آرام سے رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہاں پر اس کو کبھی موت نہ آئے گی نہ اس کے کپڑے کبھی پرانے ہوں گے نہ اس کی جوانی کبھی فنا ہو گی سدا جوان رہے گا۔ حضورؐ نے فرمایا جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ "مالا عینٌ رأتْ ولا اذنٌ سمعتْ وما خطر علی قلب بشر"

"جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا نہ اس کے متعلق کسی انسان کے دل میں خیال آیا" ۔حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ جنت کی چیزوں کے نام دنیا کی چیزوں کی طرح ہیں لیکن ان کی حقیقتیں دنیا کی چیزوں سے بالکل مختلف ہوں گی کیونکہ دنیا کی چیزوں کا مادہ مٹی جیسی غلیظ اور کمتر چیز ہے اور جنت کی اشیاء نور کی بنی ہوں گی۔ (مسلم شریف)

اللہ تعالیٰ جنت کے مکینوں کو سورۃ الرحمٰن سنائیں گے۔ جنتی آپس میں دعوتیں کیا کریں گے آپس میں پہیلیاں اور خوش فعلیاں ہوں گی۔ جنت میں نہایت تیز رفتار سواریاں ہوں گی۔ ہر جمعہ کے روز جنتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جنتی اپنی جنتوں میں مشغول ہوں گے کہ ایک نور ظاہر ہو گا لوگ اوپر نگاہیں اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھیں گے اس وقت رب العزت کا پہلا جملہ یہ ہو گا۔ "السلام علیکم یا اہل الجنۃ" یہ وہی سلام ہو گا جس کا وعدہ قرآن میں سورۂ یٰسین میں ہے۔ "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ"۔

خاتمۂ بحث

اللہ تعالیٰ کی ناراضگی (عذاب دوزخ) سے بچنے اور اس کی رضا (جنت کی نعمتوں اور اس کی شاندار زندگی) حاصل کرنے کے لئے ہم سب کو اس ناپائیدار زندگی میں ہی ہر ممکن کوشش اور جدوجہد کرنی ہوگی۔ یہ امتحانی وقت کب ختم ہو جائے کچھ پتہ نہیں لہٰذا جیسے ہی انتباہ میسر آئے اور نصیحت مل جائے فوراً پچھلی کوتاہیوں پر صدق دل سے توبہ کرنی لازم ہے۔ راہ حق میں چلنے والوں کی مشکلات دوچند ہیں انہوں نے نفس کے شیطان کے علاوہ باطل نظام ہائے کے شیاطین سے بھی ہر وقت چومکھی جنگ لڑنی ہے۔ معاشرہ کے دباؤ کا بھی مقابلہ کرنا ہے۔ اس کشمکش حیات سے صحیح طور پر سرخرو ہونے کے لئے آخرت کا صحیح اور ہمہ گیر تصور یقین کی صورت میں ہر وقت دل میں جاگزیں رہنا ضروری ہے۔ حضورؐ کی ایک جامع حدیث سنا کر اس مضمون کو تمام کرتا ہوں۔

"ان هذه القلوب لتصدأ كما يصدأ الحديد اذا اصابه الماء قيل ما جلائها يا رسول الله قال كثرة ذكر الموت وتلاوة القران"۔

"بے شک ان قلوب کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو زنگ لگتا ہے جبکہ اس پر پانی پڑے۔ پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ اس زنگ کا صیقل کیا ہے۔ فرمایا موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت کرنا"۔

گویا وہ طریقۂ زندگی کہ موت کا خیال ہر دم پیش نظر رہے اور کثرت سے قرآن کی تلاوت۔

تلا یتلو کا مطلب ہے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ گویا تلاوت سے اصل مراد قرآن کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ صرف زبانی تلاوت نہیں۔ قرآن کریم اپنی تعلیمات اور تقاضوں کے ذریعے جن جن گھاٹیوں سے گزارنا چاہتا ہے ان سے گزرا جائے جس تحریک اسلامی کے دوران یہ آخری پیغام ہدایت نازل ہوا اس تحریک کو برپا کر کے قدم بقدم چلا جائے تو تلاوتِ قرآن کا حق ادا ہو گا۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء نے اسی قرآنی تحریکِ انقلاب کا ساتھ دینے کا عزم کر رکھا ہے اب آخرت کے اس ہمہ گیر تصور کو دل میں بٹھا کر میدانِ عمل کا شہسوار بننے کی ضرورت ہے۔ نفس کے طاغوت کے استیصال کے ساتھ ساتھ معاشرے کے غلط رسوم و رواج، بدعات سے بھی انکار لازم ہے۔ ظالم نظام سے ٹکراؤ ضروری ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا

"پس جس نے طاغوت کا انکار اور اللہ پر ایمان رکھا اس نے (درحقیقت) ایک بہت بڑے سہارے (اللہ کا سہارا) کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے"۔

آخر میں صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اے الٰہ العٰلمین۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

خصوصاً ہماری تنظیم اسلامی کے ذروں کو آفتاب بنا کر شرک و باطل کے اندھیارے دور کرنے والا بنا دے۔ آمین

و اخر دعوانا ان الحمدلله رب العلمين۔

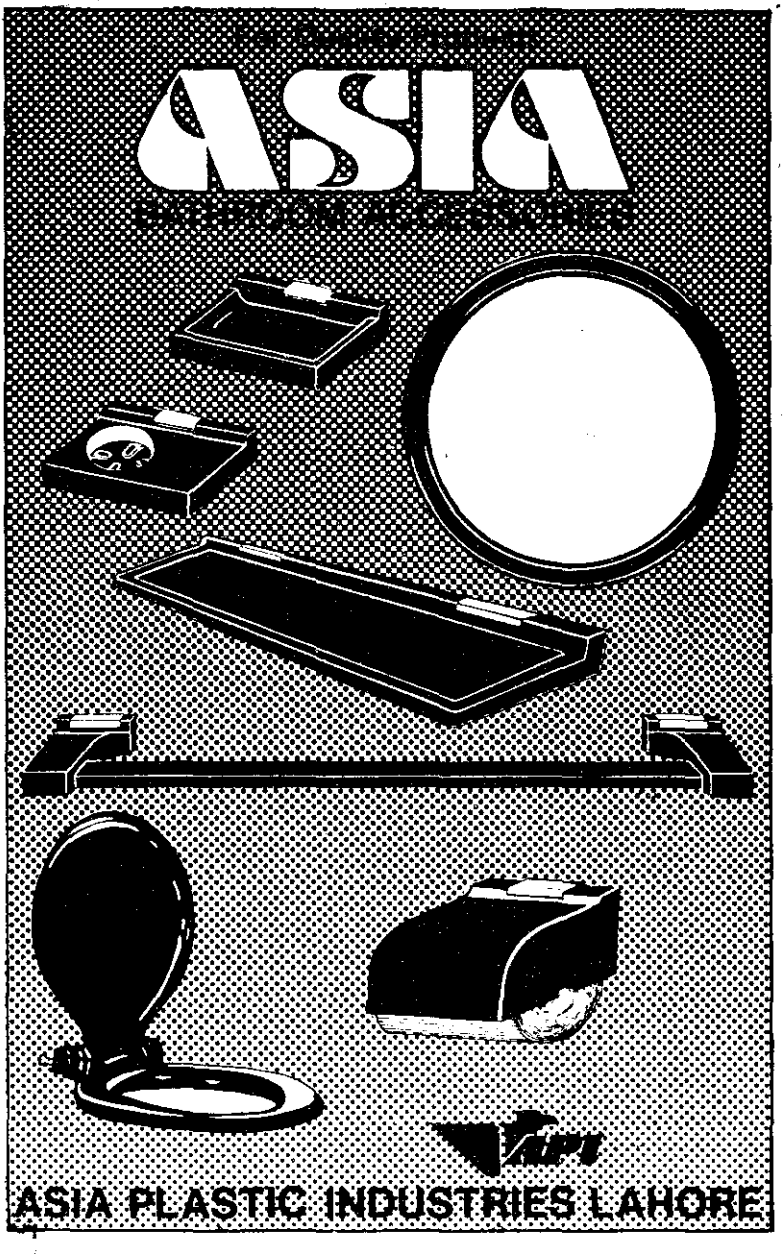

ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

رفتارِ کار

تیز ترک گامزن . . .

دسمبر ۸۸ء میں کراچی میں منعقدہ تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام مرکزی تربیت گاہ اور انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام محاضراتِ قرآنی کی رپورٹ

مرتب: رحیم کاشفی

کراچی میں رفقاء تنظیم اسلام کے لئے ایک مرکزی تربیت گاہ کا اہتمام ۱۸ر تا ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۸ء کیا گیا تھا جس میں انجمن خدام القرآن سندھ کی جانب سے منعقدہ پانچ روزہ محاضرات قرآنی کا پروگرام بھی شامل تھا۔ اس دفعہ محاضرات..... ([illegible]) کا عنوان تھا "اسلام کا نظام حیات۔" اور اس میں امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کو پانچ ذیلی موضوعات پر خطاب کرنا تھا۔ یہ خطبات ۱۷ر تا ۲۱ر دسمبر طے تھے۔

رفقاء کراچی اس پروگرام کے لئے کئی ہفتوں سے سرگرم عمل تھے، جلسہ گاہ، طعام اور قیام کے علاوہ دیگر انتظامات کو آخری شکل دے کر ۱۷ر دسمبر کی صبح سے بیرونی وفود کے استقبال کے لئے مستعد و منتظر تھے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ گاہ اور قیام کا بندوبست روایتی طریقوں کے بالکل برعکس جدید تقاضوں کے مطابق کیا گیا تھا۔ قیام کا انتظام تین مختلف مقامات پر تھا۔ اس کے لئے شہر کے قلب میں واقع ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کے علاوہ ایک فلیٹ بھی مختص کیا گیا تھا، تیسری جگہ ریلوے کا ریسٹ ہاؤس تھا، ان مقامات پر حتی المقدور سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ اسی طرح عین شہر میں واقع ایک معروف آڈیٹوریم کو بطور تربیت گاہ و جلسہ گاہ استعمال کیا گیا تھا اور اُسی کے عقب میں واقع بڑے سے خالی پلاٹ کو طعام گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ آڈیٹوریم اور قیام گاہوں کے درمیان ماسوائے ریسٹ ہاؤس کے دس منٹ کی پیدل مسافت تھی۔ لٹریچر اور آڈیو/ ویڈیو کیسٹس کی فروخت کے لئے آڈیٹوریم کے برآمدے میں اسٹالز لگائے گئے تھے۔ قریب ہی ایک استقبالیہ کاؤنٹر بھی بنایا گیا تھا۔ اس مختصر سی تمہید و ضروری تعارف کے بعد روزانہ کی رپورتاژ حاضر خدمت ہے۔

۱۷ر دسمبر ۱۹۸۸ء..... آج بیرون شہر کے رفقاء کی آمد رہی۔ انہیں متذکرہ بالا مقامات پر ٹھہرانے کے ساتھ ظہرانہ بھی قیام گاہوں میں ہی پیش کیا گیا۔ چونکہ محاضرات کا پروگرام ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا لہٰذا رفقاء اپنے ذاتی کاموں کے لئے اس وقت تک فارغ تھے۔ اس دفعہ محاضرات اس لحاظ سے بھی منفرد تھے کہ مقرر صرف امیر محترم تھے اور ہر روز بعد از خطاب علماء و دانشوروں پر مشتمل ایک پینل ان سے موضوع کے متعلق سوالات کرتا اور امیر محترم اُن کے جوابات دیتے تھے جس سے

نفس موضوع مزید واضح ہو جاتا اور کئی اشکالات بھی دور ہو جاتے تھے۔ اہلیان شہر نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور ان کا ذوق و شوق محاضرات کے آخری روز تک قائم رہا۔ ان محاضرات میں شرکت عام کے لئے بذریعہ ہینڈ بلز پبلسٹی کی گئی تھی اور مختلف مساجد سے باقاعدہ اعلان بھی کروایا گیا تھا۔ وقت مقررہ پر انجمن خدام القرآن سندھ کے صدر جناب سراج الحق سید صاحب نے تعارفی کلمات سے محاضرات کا افتتاح کیا۔ بعد ازیں امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے 'جو کہ انجمن کے نگران اعلیٰ بھی ہیں' اسلام کی نظریاتی اساس پر ایک جامع و پر مغز خطاب فرمایا۔ ان کے خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

اسلام کی فکری اساس ایمان ہے 'اگر فکر درست ہو تو عمل بھی درست ہوتا ہے اور اجتماعی سوچ اور نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا نہ ہو تو نظام تبدیل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کا نظام حیات کی اصطلاح ایک حادث اصطلاح ہے اس کا آغاز مرعوبیت اور شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی فکری اساس یعنی ایمان کی تعمیر نو کے بغیر کوئی اسلامی تحریک اسلامی نظام کے قیام پر منتج نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم کے موروثی عقائد کی بنیاد پر جس میں گہرائی اور گیرائی نہ ہو جو ذاتی سوچ میں پیوست نہ ہو کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر کوئی سیاسی تحریک تو برپا کی جا سکتی ہے 'اس میں مذہبی رنگ گہرا ہو سکتا ہے اور لوگ جانیں بھی دے سکتے ہیں 'لیکن نظام میں تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اسلام میں اس کی جڑ بنیاد ایمان باللہ ہے جو ایک مثبت قوت کا نام ہے 'اور یہ قوت قرآن ہی کے ذریعے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسلام جن چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے وہ عام انسانی فہم سے قریب تر ہیں 'نیک اور بدی کا امتیاز انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ انسان کا روحانی وجود فرشتوں کے وجود سے بھی بلند تر ہے 'اس میں عالم امر اور عالم خلق دونوں جمع ہیں حقیقی انسان وہ وجود ہے جو اس میں مضمر ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کسی فلسفی نے اپنی سوچ اور فکر کو یقین کے ساتھ حق قرار نہیں دیا اور نہ اس پر دوسروں کو ایمان لانے کی دعوت دی۔ صرف انبیاء کرامؑ نے اپنی تعلیمات کو جو وحی پر مبنی ہے حق قرار دیا اور جنہیں تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔ کائنات کے مابعد الطبعیاتی حقائق کے علم کا نام ایمان ہے۔ حکماء اپنی سوچ بچار' عقل اور منطقی استدلال کے ذریعے فلسفے پیش کرتے ہیں 'لیکن انبیاء کرامؑ اپنی تعلیمات کو غور و فکر کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ ایک اور ذریعے سے حاصل شدہ قرار دیتے ہیں 'یعنی وحی جو کہ حق ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ موت ایک وقفہ ہے معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں تبدیل ہونے کا نام ہے۔ اور اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ قرآنی تعلیمات کے ذریعے ذہین اقلیت میں حقیقی ایمانی قوت پیدا کر کے ہی نظام میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے 'صرف موروثی عقیدے سے جو اقدار میں سرایت کئے ہوئے نہیں ہے کام نہیں چلے گا۔

بعد از خطاب امیر محترم نے پینل میں شامل اہل علم و دانش کے سوالات کے جوابات دیئے۔ جس سے موضوع کے مزید گوشے نکھر کر سامنے آئے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی نامناسب نہ ہو گا کہ نماز عشاء خطاب کے اختتام پر آڈیٹوریم کے کمپاؤنڈ میں با جماعت ادا کی جاتی تھی۔ اسی طرح رفقاء ظہر' عصر اور مغرب کی نمازیں بھی وہیں با جماعت ادا کرتے تھے۔ البتہ فجر کی نماز اپنی اپنی قیام گاہوں میں با جماعت ادا کرنے کا اہتمام ہوتا تھا اور امیر محترم

کی ہدایت پر بعد نماز فجر مختصر سا درس قرآن یا کوئی وعظ دیا جاتا۔ یہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ ناشتہ بھی قیام گاہوں پر ہی کرایا جاتا تھا البتہ ظہرانہ اور عشائیہ کا اہتمام آڈیٹوریم کے عقب میں طعام گاہ میں تھا اور تربیت گاہ کے آخری روز تک یہی نظم قائم رہا۔

۱۸ر دسمبر..... رفقاء نے نماز فجر اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر تربیت گاہ کا قصد کیا۔ کیونکہ نظام العمل کے مطابق پہلی نشست کا آغاز صبح ۹ بجے ہونا تھا۔ صبح کی نشست کے اوقات ۹ تا ۱ بجے دوپہر تھے۔ درمیان میں آدھ گھنٹے کا وقفہ چائے وحوائج ضروریہ کے لئے رکھا گیا تھا۔ وقفہ میں رفقاء کو طعام گاہ میں چائے باقاعدگی سے پیش کی جاتی تھی۔

حسب پروگرام پہلی نشست کی ابتداء وقت مقررہ پر جناب سراج الحق سید صاحب امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی کے افتتاحی کلمات سے ہوئی جس میں انہوں نے رفقاء کو خوش آمدید کہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسی کی توفیق سے ہم تربیت گاہ منعقد کرنے کے قابل ہوئے۔ انہوں نے رفقاء کی توجہ پابندیٔ وقت کی طرف دلائی اور خطابات کو غور سے سننے اور مذاکرات میں بھرپور حصہ لینے کی ضرورت پر زور دیا۔ بعدازیں امیر محترم نے خطاب فرمایا۔ انہوں نے مختلف تنظیمی امور پر روشنی ڈالی اور تربیت و محاضرات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ وقفے کے بعد اقامت دین کی جدوجہد پر تین سوالات کے عنوان سے ایک مذاکرہ کا آغاز ہوا۔ پروجیکٹر کی مدد سے اس پروگرام کو جناب سراج الحق سید صاحب نے کنڈکٹ کیا اور سوالات کی توضیح و تشریح اور جوابات کے لئے مختلف رفقاء کو موقع دیا گیا۔ ان سوالات کے ذریعے اجتماعیت، تنظیم اور بیعت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا تھا۔ تربیتی پروگرام کی دوسری نشست بعد نماز عصر شروع ہوئی جس میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے فرائض دینی کے جامع تصور پر بڑی جامعیت سے روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں فرائض دینی کے تصور کو ایک سہ منزلہ عمارت کے ماڈل کی شکل میں پروجیکٹر سے دکھایا گیا جس سے پورا تصور سمجھنے میں بڑی آسانی رہی۔

شام کو محاضرات قرآنی کی دوسری نشست تھی۔ موضوع تھا "اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام۔" امیر محترم نے اپنے فاضلانہ خطاب میں فرمایا تصوف و احسان کا اصل موضوع انسان کا اللہ کے ساتھ محبت کرنا ہے۔ دین بندے اور خدا کے مابین ایک عہد کا نام ہے۔ جو شخص چھوٹے چھوٹے عہد پورے نہیں کرتا وہ بڑا عہد ایفا نہیں کر سکتا۔ تصوف قرآن و سنت کی اصطلاح نہیں، قرآن نے اس کے لئے احسان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء کرام تھے۔ انہوں نے متعدد احادیث کے حوالے سے اخلاق کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ بہتر شخص وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔ خیر اور شر کا شعور انسان کے نفس میں ودیعت کر دیا گیا ہے جس کے لئے معروف اور منکر کی اصطلاحات

متعدد احادیث کے حوالے سے اخلاق کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ بہتر شخص وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔ خیر اور شر کا شعور انسان کے نفس میں ودیعت کر دیا گیا ہے جس کے لئے معروف اور منکر کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں اور یہ پوری بنی نوع انسان کا اثاثہ ہیں۔ بنیادی اخلاقیات کے لئے انسان تعلیم و تلقین کا محتاج نہیں ہے یہ اُسے اللہ نے ودیعت کر رکھا ہے۔ دنیا میں کئی اخلاقی نظام موجود ہیں لیکن وہ صرف جزوی طور پر ہی درست ہیں۔ اخلاق کے اس بگاڑ کا حل یہی ہے کہ ایمان کی گہرائی اور گیرائی کے لئے

کوشش کی جائے اس کا نام معرفت ہے اور ایمان کی آبیاری کے لئے سب سے مستحکم ذریعہ نماز ہے۔ انہوں نے اپنے طویل خطاب میں روحانی نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کے دور کی یہ بڑی محرومی ہے کہ یہ موضوع بہت بدنام ہو چکا ہے اور لفظ تصوف تو بعض حلقوں میں ایک گالی بن کر رہ گیا ہے۔ جس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ کئی غیر اسلامی تصورات بدقسمتی سے تصوف کا جزو بن گئے ہیں۔ اس وقت مادہ پرستانہ طرز فکر نے پوری کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اسی لئے روح کے جداگانہ تشخص کا انکار کیا جاتا ہے اور جان اور روح کو ایک ہی شے تسلیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ انسان کا وجود مرکب ہے جسم و جان اور روح سے۔ خاک سے جسم بنا ہے جس میں ایک روح ہے جس کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے۔ جب روح کا غلبہ ہو تو دنیا کی حیثیت مومن کے لئے ایک قید خانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ حیوانی وجود اگر روحانی وجود پر غالب آجائے تو گویا روح دفن ہو کر رہ جاتی ہے اور جسم روح کے لئے چلتا پھرتا مقبرہ بن جاتا ہے۔ انہوں نے تزکیۂ نفس کے لئے روزہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کو اجاگر کیا اور تقرب الی اللہ کے لئے فرائض کے التزام کے ساتھ نوافل میں اعتدال و توازن کو ضروری قرار دیا۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ محبت کی تشریح کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ عشق کا لفظ قرآن و سنت میں کہیں استعمال نہیں ہوا اور اطاعت و محبت کے اعتبار سے اللہ و رسول یکجا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حبِ مال حب دنیا کی علامت ہے۔ بعد ازاں خطاب امیر محترم نے علماء اور دانشوروں پر مشتمل پینل کے سوالات کے جوابات دیئے اور وضاحتیں فرمائیں۔ شہر بھر کے یارانِ نکتہ داں نے بھرپور شرکت کی۔ حسب سابق نشست کے اختتام پر عشاء کی نماز ادا کی گئی۔

گفٹ کارڈ سکیم کے تحت!

- ماہِ جنوری اور فروری ۸۹ء کے دوران ماہنامہ میثاق کے نئے سالانہ خریداروں کو ایک ٹیلی فون انڈکس یا میثاق کے ۱۲ شمارے محفوظ رکھنے کے لئے گتے کا مضبوط کور مفت ارسال کیا جائے گا۔
- آپ کی سہولت کے پیشِ نظر سالانہ خریداری کے کوپن منسلک کر دیئے گئے ہیں جن کی مدد سے آپ اپنے یا احباب میں سے کسی ایک یا دو حضرات کے نام ماہنامہ "میثاق" جاری کرا سکتے ہیں۔ اندرونِ پاکستان کوپن پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں۔

نوٹ: آپ ٹیلی فون انڈکس یا کور میں سے جو پسند فرمائیں کارڈ پر درج فرما دیں۔

گفٹ کار

کوپن برائے سالانہ خریداری

میں اپنے عزیز/ دوست کے نام ایک سال/ دو سال کے لیے
ماہنامہ 'میثاق' جاری کرانا چاہتا ہوں۔ ازراہِ کرم درج ذیل پتے پر
ایک سال/ دو سال کے لیے 'میثاق' جاری کر دیجئے۔ زرتعاون پچاس
روپے/ ایک صد روپے بذریعہ منی آرڈر/ بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام ------------------------------

پتہ ------------------------------

نوٹ: جو حضرات زرتعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے -/۶۰ روپے اور دو سال کے لیے -/۱۱۰ روپے کا چیک بھیجیں، اس لیے کہ -/۱۰ روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے جاتے ہیں۔

* **تحفہ کے لیے تفصیلات سامنے کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں**

گفٹ کار

کوپن برائے سالانہ خریداری

میں اپنے عزیز/ دوست کے نام ایک سال/ دو سال کے لیے
ماہنامہ 'میثاق' جاری کرانا چاہتا ہوں۔ ازراہِ کرم درج ذیل پتے پر
ایک سال/ دو سال کے لیے 'میثاق' جاری کر دیجئے۔ زرتعاون پچاس
روپے/ ایک صد روپے بذریعہ منی آرڈر/ بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام ------------------------------

پتہ ------------------------------

نوٹ: جو حضرات زرتعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے -/۶۰ روپے اور دو سال کے لیے -/۱۱۰ روپے کا چیک بھیجیں، اس لیے کہ -/۱۰ روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے جاتے ہیں۔

* **تحفہ کے لیے تفصیلات سامنے کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں**

جوابی کاروباری سروس۔ پرمٹ نمبر ۱۳۱۹

اندرون پاکستان
ٹکٹ لگانے کی
ضرورت نہیں

منجانب
پتہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
لاهور۔ ۵۴۷۰۲
پاکستان

جوابی کاروباری سروس۔ پرمٹ نمبر ۱۳۱۹

اندرون پاکستان
ٹکٹ لگانے کی
ضرورت نہیں

منجانب
پتہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
لاهور۔ ۵۴۷۰۲
پاکستان

۱۹ر دسمبر..... آج تربیت گاہ کی پہلی نشست کے پروگرام میں امیر محترم کی ہدایت پر تبدیلی کی گئی اور اسے حالات حاضرہ سے متعلق رفقاء کے نقطۂ نظر کے لئے مختص کر دیا گیا۔ جس میں مقررین نے کھل کر اپنا موقف پیش کیا۔ ہدفِ تنقید زیادہ تر سیاسی موضوعات خصوصاً جماعت اسلامی کے بارے میں "ندا" اور "میثاق" کے مضامین رہے۔ "ندا" کے بیالیسویں شمارے کے سرورق پر شائع شدہ تصویر پر بھی گرفت کی گئی۔ اس کے برعکس دو افراد نے "ندا" کی پالیسی سے اتفاق کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس نرم گرم نشست میں "ندا" سے متعلق اٹھائے گئے اہم نکات اور اعتراضات کے جواب میں وضاحتیں دوسری نشست میں مدیر "ندا" جناب اقتدار احمد صاحب نے خود پیش کیں۔ بعدازیں امیر محترم نے بڑے مؤثر اور دلنشیں پیرایہ میں اشکالات رفع کئے۔ انہوں نے اصلاحی و تبلیغی اور احیائی و انقلابی کاموں میں فرق و تمیز کے حوالے سے نظری سیاست کی اہمیت کو واضح کیا۔ بعد نماز عصر حلقۂ تنظیم کی جانی پہچانی شخصیت مولانا اخلاق حسین قاسمی (دھلوی) مدظلہ نے خطاب فرمایا اور رفقاء کے طمانیت قلبی کا سامان مہیا کیا۔ انہوں نے رفقاء کے حوصلے بلند کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ قلت و کثرتِ تعداد کامیابی و ناکامی کا پیمانہ نہیں ہے۔ اصل شے درست فکر و عمل ہے۔

شام کو محاضرات قرآنی کی تیسری نشست میں امیر محترم نے اسلام کے سماجی و معاشرتی نظام پر ایک فکر انگیز خطاب فرمایا۔ انہوں نے فرمایا کہ اجتماعی نظام کی اساس اجتماعی فکر ہوتی ہے۔ انسانوں پر ظلم تین جہتوں سے ہوتا آیا ہے جو سماجی سطح پر اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تقسیم کے ذریعے، معاشی میدان میں استحصال اور سیاسی سطح پر تمیز بندہ و آقا اور لوگوں کی آزادی سلب کر کے اپنا اظہار کرتا ہے۔ انہوں نے مختلف سماجی و معاشرتی نظریات کا تجزیہ پیش کیا کہ ان سب میں ظلم کا عنصر شامل ہے۔ اشتراکی اور سرمایہ داری نظام اپنے مخصوص نمائشی نعروں (CATCH-WORDS) کے ذریعے حریّت و مساوات میں تقدیم و تاخیر کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا مرکزی تصور عدل و قسط ہے۔ غیر مسلم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار حریت و مساوات و اخوت کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام عدل قائم کر کے دکھا دیا تھا۔

انہوں نے کہا کہ عائلی و معاشرتی مسائل اتنے ہی قدیم ہیں جتنا خود انسان ہے اور سب سے وسیع ظلم معاشرتی سطح پر ہی ہوتا آیا ہے۔ جبکہ اسلام سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات کا درس دیتا ہے۔ جنس کی بنیاد پر شرف انسانیت میں کوئی فرق و تفاوت نہیں۔ پیدائشی طور پر نہ کوئی اعلیٰ ہے نہ ادنیٰ۔ انسانی ہمدردی کا دائرہ غیر مسلموں تک وسیع ہونا چاہئے لیکن ان سے قلبی تعلق رکھنا قرآن و سنت کے منافی ہے۔

انہوں نے خدمتِ خلق کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سب سے بڑی خدمت خلق انسانیت کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ معاشرتی زندگی کا نقطۂ آغاز رشتۂ ازدواج ہے۔ کسی ادارے میں مساوی اختیار والے دو سربراہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اگر مصنوعی طور پر مساوات مرد و زن کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو خاندانی نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ میاں بیوی کا رشتہ باہمی اعتماد پر قائم رہتا ہے۔ مرد کی حاکمیت کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عورت کے

لئے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا جس قدر آج مشکل ہے اتنا ہی پہلے بھی تھا۔ اسی لئے عائلی احکامات بھی تدریجاً نازل ہوئے۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں اور انہیں حاکمیت حاصل ہے۔ قرآن نے عائلی معاملات پر مفصل احکامات دیئے ہیں اور اس میں مکمل عائلی نظام موجود ہے۔ عورت کا بنیادی دائرہ کار اس کا گھر ہے' اس کی گود بہترین درس گاہ ہے۔ وراثت' شہادت اور طلاق و خلع کے معاملات کے حوالے سے انہوں نے فرمایا کہ قرآن عورت کو قانونی حیثیت دیتا ہے۔ اسلام نے عورت کو اخلاقی سطح پر بڑی فوقیت دی ہے اور ماں کے قدموں تلے جنت بتائی گئی ہے۔ والدین کو محبت بھری نگاہ سے دیکھنا بھی موجب اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے اختلاط مرد و زن کو خطرناک قرار دیتے ہوئے ستر و حجاب کی حکمت کو واضح کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر معیشت کے لئے ناگزیر ہی ہو جائے تو خواتین کے لئے ملازمت کے علیحدہ مواقع فراہم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ انہیں گھر پر ہی کام فراہم کیا جائے۔ انہوں نے خواتین کے لئے اوقات کار چار گھنٹے رکھنے کی تجویز پیش کی۔

بعد از خطاب معمول کے مطابق سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس خطاب میں بھی سامعین بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

۲۰ر دسمبر..... نظام العمل کے مطابق آج صبح کی نشست میں مذاکرہ کا پروگرام تھا۔ موضوع تھا اقامت دین کا طریقۂ کار۔ کمپئرنگ کے فرائض جناب سراج الحق سید صاحب نے ادا کئے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سوالات کے ذریعے منہج انقلاب نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرایا اور ان کی توضیح و تشریح کی گئی۔ سوالات کو نمایاں کرنے کے لئے پروجیکٹر کا سہارا لیا گیا تھا۔ مذاکرہ وقفے کے بعد بھی جاری رہا۔ رفقاء نے بھرپور حصہ لیا اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں سوالات کے جواب دیئے۔

بعد نماز عصر ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب (کراچی) نے تزکیۂ نفس کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ انہوں نے تزکیۂ نفس کے اصول و مبادی بیان کئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف تنظیم اسلامی کے سابقہ رفیق ہیں۔

آج محاضرات کا موضوع تھا "اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام"۔ امیر محترم نے اپنے خطاب میں اسلام کے اصولِ سیاست و حکمرانی کو بڑی حسن و خوبی سے واضح کیا۔ اور اس بارے میں کئی ابہام دور کئے۔ انہوں نے اپنے طویل خطاب میں فرمایا کہ اسلامی ریاست قومی نہیں بلکہ نظریاتی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمدّن کے ارتقائی عمل کی وجہ سے اسلام نے حکومت کی تشکیل کے بارے میں تفصیلی احکامات نہیں دیئے بلکہ صرف اصول عطا کئے ہیں۔ وفاقی' وحدانی اور صدارتی یا پارلیمانی طرز ریاست و حکومت میں سے کوئی بھی اسلام کے منافی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اسلام ہے۔ تمام مسلمان بلا لحاظ رنگ' نسل' زبان اور علاقہ اسلامی ریاست کے شہری ہو سکتے ہیں۔ پچھلی صدی تک ملتِ واحدہ کا تصوّر پوری طرح رائج تھا۔ ایک مسلمان کسی بھی مسلم علاقہ میں سکونت اختیار کر سکتا تھا' اس کے لئے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں تھی' لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی استعمار نے اس وحدت کو پاش پاش کر دیا اور مسلمانوں میں تقسیم در تقسیم کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ انہوں نے پاکستان کے حالات کے پس منظر میں کہا کہ اگر چار قومیتیں ہو سکتی ہیں تو پانچویں کو بھی اپنا وجود تسلیم کرانے کا حق ہے

اور اس کے بعد چھٹی اور ساتویں قومیتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن تقسیم در تقسیم کا یہ عمل وحدت ملت پر کاری ضرب ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی ریاست میں حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کو حاصل ہے کسی اور کے لئے ایسا تسلیم کرنا کفر ہے۔ نظام خواہ کوئی ہو اگر شرعی حدود میں رہ کر اختیارات استعمال کئے جائیں تو وہ اسلامی حکومت کہلا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عوامی خلافت کا کامل نمونہ خلافت راشدہ تھی اور اب اس کا بعینہ نقشہ قیامت تک قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ نبوت کا تتمہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر سیکولر ہے۔ انہوں نے کہا اسلامی ریاست انقلاب کے نتیجہ میں ہی معرض وجود میں آ سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کے خدوخال کی وضاحت کرتے ہوئے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اسلامی ریاست میں کوئی فرد قانون سے بالاتر نہیں اور حکمران کو کسی مجرم کی سزا معاف کرنے کا اختیار نہیں۔ صرف مسلمان ہی اسلامی ریاست کا مکمل شہری ہو سکتا ہے البتہ غیر مسلموں کے حقوق اور ان کی جان، مال اور آبرو کا تحفظ کیا جائے گا۔ انہیں آزادئ عقیدہ و عبادت ہو گی وہ اپنی نسل میں اپنے عقیدہ کا پرچار کر سکتے ہیں مگر اسلامی ریاست میں کسی دوسرے مذہب کی عام تبلیغ نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ووٹر کے لئے عمر کی شرط چالیس سال تجویز کی جو کہ ذہنی پختگی کی عمر ہے۔ انہوں نے کہا کہ ووٹ کے معاملہ میں فاسق و فاجر کی کوئی قید نہیں۔ قانونی اعتبار سے فاسق و فاجر اور مومن و متقی دونوں برابر ہیں شہریت کی بنیاد اسلام ہے۔ خواتین بھی رائے دہی میں شامل ہو سکتی ہیں لیکن امور مملکت میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ اسلامی ریاست میں امور مملکت صرف مردوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ انہوں نے علماء کو توجہ دلائی کہ اس وقت ان کا اہم ترین کام جذبۂ ایمان کی بیداری اور فہم دین کی اشاعت و ترویج ہے تاکہ کوئی اسلام کے نام پر مسلمانوں کو دھوکہ نہ دے سکے۔

خطاب کے بعد حسب معمول سوال و جواب کی نشست رہی آج کے خطاب میں حاضری مزید بڑھ گئی تھی اور اسٹیج پر دریاں بچھانی پڑیں۔ خطاب کے اختتام پر کراچی میں منعقد ہونے والی ایک مخلوط دوڑ کے خلاف ایک قرارداد مذمت بھی پاس کی گئی جس کا متن شامل اشاعت ہے۔ ۲۱ر دسمبر آج تربیت گاہ کے ساتھ محاضرات کا بھی آخری دن تھا۔ پہلی نشست کی ابتداء میں امیر محترم نے رفقاء سے مختصر خطاب فرمایا۔ انہوں نے چند نووارد رفقاء کا تعارف پیش کیا اور ترکِ رفاقت کر جانے والوں کا بھی افسوس کے ساتھ ذکر کیا۔ اور باقی وقت اسلام آباد کے مولانا فیض الرحمٰن صاحب کے لئے مختص فرمایا۔ مولانا صاحب موصوف تنظیم کے نئے رفقاء میں سے ہیں۔ درس نظامی کے ساتھ گریجویٹ بھی ہیں اور اب ایل ایل بی کا امتحان دے کر لاء گریجوایٹس میں شامل ہونے والے ہیں۔ ان دنوں اُن کے امتحانات بھی ہو رہے تھے۔ اُن کی تقریر بڑی جاندار اور پرجوش تھی۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز بیان سے رفقاء میں نہ صرف حرارت پیدا کی بلکہ مسکراہٹیں بھی تقسیم کیں۔ انہوں نے اقامتِ دین کی جدوجہد کو پشتو کی ایک کہاوت سے واضح کیا کہ باپ کی زمین پر دشمنوں کا قبضہ ہو تو بیٹا صرف اباجان، اباجان کی گردان کر کے (ایک انچ بھی) زمین واگزار نہیں کرا سکتا۔ انہوں نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا کہ اللہ کی زمین پر طاغوت کا قبضہ ہو اور اللہ کے ماننے والے صرف اللہ ہو کی رٹ لگاتے رہیں تو دین قائم و نافذ نہیں ہو سکتا اس کے لئے باطل قوتوں سے ٹکراؤ لازمی ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد امیر محترم نے رفقاء کے سوالات کے جوابات دیئے اور کئی اشکالات رفع کئے۔ ایک لحاظ سے یہ تربیت گاہ کا آخری مرحلہ تھا جس کے بعد دعا مانگی گئی۔ لیکن امیر محترم کی خواہش کے مطابق بعد نماز عصر ایک مزید خطاب سندھ کی صورت حال پر بھی رکھا گیا۔ مقرر تھے سندھ کے معروف دانشور پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب' اُن کا تعلق سکھر سے ہے۔ انہوں نے اندرون سندھ لادینیت و دہریت کا علمی سطح پر مقابلہ کے لئے ادارہ فکر و نظر قائم کیا ہے۔ وہ سندھ کی اسلامی تاریخ کے حوالے سے اسلامی فکر کو پھیلانے کا کام سرانجام دے رہے ہیں انہوں نے بڑی جذباتی تقریر کی۔ انہوں نے باب الاسلام سندھ کی اسلام سے وابستگی کی تاریخ کے حوالے سے موجودہ انتخابی نتائج کو بھی سندھیوں کے اسلام سے لگاؤ کا مظہر قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ سندھ کے عوام نے ایک طرف لادین عناصر کو شکست دی تو دوسری طرف اسلام کے بارے میں منافقانہ کردار ادا کرنے والوں کو بھی رد کر دیا۔ انہوں نے قدیم سندھی علماء کے سیرت و کردار پر مبنی لٹریچر کو بڑے پیمانے پر شائع کرنے اور پھیلانے کی ضرورت پر زور دیا۔ شام کو بعد نماز مغرب امیر محترم نے محاضرات قرآنی کے آخری موضوع "اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام" پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ خطاب کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام کا معاشی نظام پیچیدہ اور مشکل ہونے کے ساتھ کسی قدر اختلافی ہے۔ معاشی و اقتصادی امور ملکی معاملات میں بڑے موثر اور فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے آج کے دور میں انسان کو معاشی حیوان کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کے بعض اہم پہلو ملوکیت کی وجہ سے تاریکی کے پردہ میں چلے گئے لیکن اب وہ دوبارہ نمودار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے دو بڑے نظام ہائے معیشت کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں آزادی ہے لیکن مساوات نہیں اور اشتراکی نظام میں مساوات ہے لیکن آزادی نہیں' لیکن دونوں کی قدر مشترک اور ان کی فکری و نظری اساس مادہ پرستی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی نظام معیشت کے دو پہلو ہیں ایک ایمانی و روحانی اور دوسرا قانونی و انتظامی اور دونوں میں بظاہر تضاد بھی معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ اسلام میں ملکیت حقیقی صرف اللہ کی ہے اور انفرادی ملکیت کا تصور مجازی ہے۔ دراصل تمام دنیوی نعمتیں انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں انسان کو دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے اور اسے اس پر صرف ضرورت کی حد تک حق تصرف حاصل ہے' جو بچ جائے وہ بطور امانت دوسروں کا حق ہے۔ انہوں نے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس کبھی مال جمع نہیں کیا کہ مال کا جمع رکھنا توکل علی اللہ کے اعلیٰ معیار کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام میں روحانی اور قانونی دونوں تعلیمات ہیں دنیا کا نظام روحانیت پر نہیں' قانون پر چلتا ہے' لیکن معاشرہ میں قانونی نظام کے مکمل نفاذ کے باوجود مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ روحانی نظام بھی ساتھ ساتھ نہ چلے گو وہ معاشرہ کی ایک اقلیت تک ہی محدود ہو اسلام سرمایہ کو پابند کرتا ہے اور سب سے زیادہ تحفظ محنت کو عطا کرتا ہے۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے حوالے سے سود کی حرمت و شناعت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ معاشرہ سود میں اسطرح تیر رہا ہے جس طرح مچھلیاں پانی میں۔ اسلام میں اپنی ضرورت سے زائد مال کے مصارف انفاق فی سبیل اللہ' قرض حسنہ اور مضاربت ہیں اسلام اسراف و تبذیر' منشیات اور جنسی نمائش کے ذریعے کاروبار کی ممانعت کرتا ہے۔

مزارعت ممنوع اور ارتکاز دولت خلاف اسلام ہے۔ احتکار سٹہ اور آڑھت کی اسلامی معیشت میں کوئی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جزوی طور قومیانے کی پالیسی خلاف اسلام نہیں۔ موجودہ زوال پذیر معیشت کا حل پیش کرتے ہوئے انہوں نے توجہ دلائی کہ پاکستان کی زمین خراجی ہے عشری نہیں۔

خطاب کے اختتام پر معمول کے مطابق دانشوروں اور ماہرین کے پینل نے سوالات کئے اور توضیحات بھی پیش کیں جس سے اسلام کے نظام معیشت کی حقانیت مزید نکھر کر سامنے آ گئی۔ اس خطاب کے ساتھ ہی محاضرات قرآنی کا پروگرام بھی اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔

۲۲ر دسمبر ۱۹۸۸ء........تربیتی پروگرام سے ہٹ کر، آج کے دن کے لئے بیرون شہر سے آئے ہوئے رفقاء کے لئے ایک اجتماعی تربیتی پروگرام بھی ترتیب دیا گیا، جو مختلف اہم اور دلچسپ مقامات کی سیر اور دورہ پر مشتمل تھی۔ اس کا دورانیہ چار گھنٹے تھا۔ متمنی رفقاء کے لئے بس کی سہولت بھی فراہم کی گئی تھی۔ سیر کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ حالات کا مطالعہ بھی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے رفقاء نے یہ دونوں مقاصد حاصل کئے ہوں گے۔ اس طرح اللہ کے فضل و کرم سے تربیتی پروگرام مکمل ہوا اور رفقاء عازم سفر ہو گئے۔

مخلوط دوڑ...... مغرب کی بھونڈی نقالی

"انجمن خدام القرآن سندھ کے زیراہتمام ریکس آڈیٹوریم میں منعقد ہونے والا محاضراتِ قرآنی کا یہ اجتماع جمعہ ۲۳ر دسمبر کی صبح مجوزہ مخلوط دوڑ پر تشویش کا اظہار کرتا اور اس کی پرزور مذمت کرتا ہے جسے ایک اشتہاری پوسٹر کے مطابق نیشنل گارڈ روڈ ریس ۱۹۸۸ء کا نام دیا گیا ہے اور جو مزارِ قائد اعظم سے شروع ہو کر اسی مقام پر ختم ہوگی۔ اس نام نہاد قومی دوڑ میں مردوں کے ساتھ جہاں قوم کی وہ بیٹیاں شریک ہوں گی جو مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کی آرزو رکھتی ہیں، وہاں ایسی بچیاں بھی شوقِ مہم جوئی کا شکار ہو جائیں گی جنہیں اس منکر کا شعور نہیں اور دین کی حدود و قیود کا پورا فہم بھی نہیں۔

کراچی شہر کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ طبقات کی نمائندگی کرنے والا یہ بڑا اجتماع اس پروگرام کی شدید مذمت کرتا اور اس کے ذمہ داروں کو مُتنبہ کر دینا چاہتا ہے کہ وہ کُھل کھیلنے سے باز آ جائیں۔ ملک خداداد پاکستان کے مسلمانوں نے بالعموم اور دین و ملت کے بہی خواہوں نے بالخصوص اسلام کے مسلّمہ اصولوں کے علی الرغم ملک میں سیاسی اور جمہوری عمل کے احیاء کے ضمن میں ایک خاتون کو اگر سربراہ حکومت کے طور پر گوارا کر لیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی غیرت وحمیّت دینی کو مزید للکار کے ردعمل کے جارحانہ اظہار پر مجبور کیا جائے جو کراچی کی مخدوش فضا میں تلخی اور کشیدگی کے اضافے کا باعث ہوگا۔ اب بھی وقت ہے کہ مغرب زدہ اور اباحیّت پسند حلقے اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت رکھنے والے اس ملک میں جو ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی پس منظر رکھتا ہے، مغربیت کی بھونڈی نقالی اور لادینیت کی یلغار برداشت نہ کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی اہل دین پر بھی لازم ہے کہ آبادی میں دین کا علم و شعور عام کریں تاکہ منکرات کو فروغ نہ ہو۔

یہ اجتماع عوام کے جذبات کی نمائندگی کا دعویٰ رکھنے والی سندھ کی صوبائی حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ صورت حال کی نزاکت محسوس کرے اور ملکِ عزیز میں اسلام کی قدروں پر بلاواسطہ یا بالواسطہ وار کرنے والوں کے ہاتھ روکے۔ مجوزہ دوڑ کے منتظمین کو اگر خوب و زشت کا امتیاز نہیں تو حکومت کا فرض ہے کہ انہیں اس مخلوط دوڑ کے اہتمام سے باز رکھے اور اسے صرف لڑکوں اور مردوں کے لئے مخصوص کیا جائے۔"

ایک مسنون دُعا

اَللّٰھُمَّ طَہِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ
وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّیَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْکَذِبِ
وَاَعْیُنَنَا مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَۃَ
الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ۔

ترجمہ

اے اللہ ہمارے دِلوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ہمارے اعمال کو ریا سے اور ہماری زبانوں کو جھُوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

* * *

عطیہ اشتہار

میاں عبدُ الواحِدْ
نیگوان سٹریٹ ، پرانی انارکلی ، لاہور

خطوط و نکات

جا ایں جا ست

ریاض (سعودی عرب) سے محترم اختر ہاشمی کا مفصل مکتوب

مکتوب نگار خانوادۂ حضرت شیخ الہندؒ سے تعلق رکھتے ہیں اور جیساکہ انہوں نے خود تحریر فرمایا ہے' اپنی عمر عزیز کے ساٹھ برس پورے کر چکے ہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ اکابر علماء کی صحبت میں گزرا اور برصغیر کی اہم دینی احیائی تحریکوں کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ زیر نظر مکتوب کے جملہ مندرجات سے گو ادارے کو اتفاق نہیں لیکن مکتوب نگار کے علمی مقام کے پیشِ نظر اس خط کو من و عن شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

محترم المقام ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اولاً اپنا تعارف

دہلی کا رہنے والا ہوں۔ ولادت ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ ننھیال ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خاندان سے متعلق ہے۔ والد صاحب حضرت شیخ الہندؒ سے نسبت رکھتے تھے۔ خلافت کے زمانہ سے پریکٹس چھوڑ کر تجارت اور انکم ٹیکس کے مقدمات کی پیروی تک محدود رہ گئے تھے۔ نہایت دین دار اور متقی بزرگ تھے۔ حج سے فراغت کے ایک سال بعد ۱۹۴۵ء میں وفات پا گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ سے تعلق بڑھا لیکن بیعت نہ ہوئے اور آخر میں مولوی محمد الیاس صاحبؒ بانیٔ جماعت تبلیغ سے عشق کی حد تک تعلق تھا...... ہم تین بڑے بھائی حافظ ہوئے اور عربی' فارسی کے عالم بھی۔ ساتھ ہی ضرورتِ وقت کے پیش نظر انگریزی تعلیم سے بھی بے بہرہ نہ رہے۔ یہ شاید اس کا اثر تھا کہ سابق وزیر و وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشیؒ کے تعلیمی دور میں دہلی میں میرے والد صاحب ہی ان کے سرپرست و نگران تھے...... میں نے دورۂ حدیث حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام مولوی سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے زیر سایہ مکمل کیا' تفسیر میں مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ میرے استاد تھے۔ درس نظامی میں ان حضرات کے علاوہ مولوی

اشفاق حسین صاحب کاندھلویؒ اور مولوی شریف اللہ صاحب (یہ دونوں حضرات مولوی ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ اور مولوی اخلاق حسین صاحب قاسمی کے بھی استاد تھے) بھی شامل تھے..... قاسمی صاحب مجھ سے نسبتاً سینئر تھے وہ میرے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ کے ہیں..... میں نے حفظ قرآن کے بعد تجوید اور پھر سبعہ قرأت وغیرہ کی بھی تکمیل کی..... میری علمی، دینی اور ذہنی تربیت مولوی محمد کفایت اللہ صاحب اور مولوی قاری محمد طیب صاحب (بعد میں یہ دونوں حضرات رشتہ میں میرے سمدھی بھی بنے) مولوی سید حسین احمد صاحب مدنیؒ جو میرے شیخ اور مشفق استاد بھی تھے۔ مولوی محمد الیاس صاحبؒ، مولوی ابوالکلام آزاد صاحبؒ، مولوی احمد سعید صاحب، مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ اور قطبِ وقت حضرت مولوی عبدالقادر صاحبؒ رائپوری جیسے اکابر کی نگرانی میں ہوئی حاشا یہ خودستائی نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ ان سب کی ہی خصوصی صحبتیں، شفقتیں اور قربتیں مجھے نصیب رہیں فللّٰہ الحمد علی ذلک!

سیاسی رجحان کانگریس ہی کی طرف تھا لیکن امام الہندؒ کی خدمت میں مسلسل حاضری سیاسی سے کہیں زیادہ جاں نثارانہ تھی جو ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء تک ان کے آخری غسل تکفین و تدفین تک جاری رہی.....!

۱۹۴۷ء کی قیامت اور ہنگامۂ دار و گیر میں جب گھر بار وغیرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سبزی منڈی دہلی سے بلیماران دہلی منتقل ہوا۔ جائیدادیں مٹی اور اثاثے خاک ہو چکے تھے فکر معاش کے پیش نظر جب شکستہ سامانی سے بھری پُری دنیا میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ علم کی جو جنس میرے پاس ہے۔ اس کا کوئی خریدار ہی نہیں مجبوراً دنیاوی تعلیم کے حصول کی طرف توجہ کی اور حالات نے علی گڑھ کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا پھر جو دور گزرا سراسر دنیاوی اور مادی کہ معمّوں اور فلموں تک کی کمائی سے عار رہا۔ (خدا کا شکر ہے شمع میگزین اور فلم ڈسٹری بیوشن سے تعلق ختم ہونے کے بعد سے اب تک تجارت ہی پیشہ ہے..... سعودی عرب میں دو سال ایک امریکی کمپیوٹر کمپنی کی ملازمت کے بعد سے اب پھر یہاں بھی محوِ تجارت ہوں) اگرچہ حضرات اکابر ایک ایک کر کے دنیا سے منہ موڑتے چلے گئے۔ پھر بھی جو دینی مزاج ایک مرتبہ ان حضرات اکابر کے صدقہ میں دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا تھا وہ کلیتہً نہ مٹ سکا۔

ثانیاً طلبِ صادق

کسی حد تک جماعت تبلیغ سے وابستگی برقرار رہی لیکن اُن کے ہاں تنظیم کا فقدان ہی نہ تھا

بلکہ وہ شجرِ ممنوعہ تھی جبکہ اسلام میں تنظیم اساسی حیثیت رکھتی ہے نماز با جماعت جمعہ و عیدین اس کا بدیہی ثبوت ہیں..... جماعت اسلامی جو یقیناً امام الہندؒ کی تحریک حزب اللہ کا ہی ریفلیکشن تھی اس کی چھان پھٹک سے ظاہر ہوا کہ مودودی صاحب نے بھی ابوالکلام کی انانیت کی بھونڈی تقلید کو اپنا شعار بنالیا جب کہ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" کے مصداق ابوالکلام میں انانیت نہیں بلکہ ایک پاکیزہ محبوبیت تھی' جو ان کی ذکاوت' فطانت' فکر و تدبر اصابت رائے اور دور بینی کی وجہ سے اتنی اوپری بھی محسوس نہ ہوتی تھی جب کہ مودودی صاحب میں سوائے تحریری صلاحیت کے کچھ بھی نہ تھا کہ ایک فری لانسر رائٹر کی طرح ان کی سب سے پہلی تحریر پردہ کی مخالفت میں تھی جو کسی مصری تحریر سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد پردہ کی حمایت میں ایک کتاب لکھ کر ہندوستان کے مذہبی مسلم حلقوں سے بھی خراج تحسین وصول کر لیا..... مقابلتاً ابوالکلام استقامت و عزیمت کی وہ چٹان تھا کہ ۱۹۴۶ء میں جب صحافیوں نے کلکتہ میں پوچھا کہ پاکستان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو نہایت متانت سے کہا:

> "پاکستان مسلمانوں کی اکثریت' کا مطالبہ ہے اس لئے بن جائے گا..... لیکن اپنے تمام جغرافیائی اور علاقائی عوامل کے باوجود صرف مذہب کی بنیاد پر پاکستان کے یہ دونوں ٹکڑے متحد رہ سکیں گے؟ مجھے اس کا یقین نہیں.....!"

یہ تھی..... اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله والی بصیرت..... "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا" پھر اس پر مستزاد یہ کہ ابوالکلامؒ جیسی ٹھوس علمی و تحقیقی صلاحیت اور بھرپور مطالعہ سے محروم ہوتے ہوئے بھی تفہیم القرآن کی وجہ تالیف میں یہ تعلّی کہ قرآن جو عربی مبین میں تھا اس کی توضیح کے لئے کسی اردوئے مبین ہی کی ضرورت تھی۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

پھر یہ کہ جماعت اسلامی نے علمائے حق کی نظر اندازی کو ہی اپنا مطمح نظر بنالیا' جبکہ ابوالکلامؒ جیسے علمی بحر ذخار نے نہ صرف ان کا دم بھرا بلکہ پورا پورا احترام بھی کیا..... حضرت مدنیؒ کے سامنے وہ کیسے بچھ جاتے تھے یہ آنکھوں دیکھی بات ہے' جب کہ حضرت مدنیؒ اور ان کے رفقاء کی نظر ہمیشہ ابوالکلامؒ کی مدبرانہ' مجتہدانہ اور قائدانہ ہدایات پر رہتی تھی اس پر یہ نیاز مندانہ اور

فدویانہ انداز لاریب ابوالکلامؒ کا ہی ظرف تھا کہ ع "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر" کا صحیح مصداق تھا۔ ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

جب مسلم عوام سے علی برادران اور پھر مسٹر محمد علی جناح کے مقابلہ میں ان کے جذبۂ محبوبیت کو ٹھیس پہنچی تو مسلم عوام کے ساتھ کسی تحریک کو لے کر بڑھنے سے انہوں نے بے شک کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن جذباتی مسلم نوجوانوں کی چیرہ دستیوں کے باوجود وہ مسلمانوں کی سیاسی تعمیرِ نو اور ان کے بہتر مستقبل کی فکر سے آخری سانس تک دست کش نہ ہوئے تھے۔ اس کی روداد تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں ہی کو معلوم ہے۔

مودودی صاحب کی وفات کے بعد ایک ضخیم کتاب "سید مودودی" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں مودودی صاحب کی مدرسہ مسجد فتح پوری دہلی کی تین سندات کا عکس ہے، جس میں سے صرف ایک تاریخ درج ہونے کی وجہ سے مستند کہی جا سکتی ہے اس سے بھی ان کی علم دین کی تکمیل کا اندازہ نہیں ہوتا۔ با ایں ہمہ انہوں نے زبان سے نہیں لیکن عملی طور پر ہمیشہ "ہم چوں من دیگرے نیست" کا ادّعا کیا اور علمائے حق کی طرف رجوع کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا اور صرف اردو میں لکھی ہوئی اسلامی تعلیمات کی کچھ کتابوں کو پڑھ کر ہی لوگوں کو علمائے حق کی ہمسری بلکہ علم میں ان سے بڑھ جانے کا احساس دلایا یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص اردو میں لکھی ہوئی الکٹریکل گائیڈ نامی کتاب پڑھ کر ایک کوالیفائیڈ الیکٹریکل انجینئر کی برابری کا دعویٰ کرنے لگے..... اس میں شک نہیں کہ علماء کے باہمی اختلاف نے علم دین کی ناقدری اور علماء سے دوری کے لئے زمین ہموار کی اور علماء سوء نے تو باقاعدہ اس کے سہارے اپنی دکانیں جمائیں، گدیاں سجائیں اور جلب منفعت کے لئے ان اختلافات کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا لیکن خدا کے فضل سے ہر دور میں علمائے حق نے ہمیشہ ہی اخلاص کے ساتھ اظہار حق کو اپنا طغرائے امتیاز بنایا..... یہ کل کی بات ہے کہ مسلم لیگ کے مقتدر رہنما علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے مسٹر لیاقت علی کے مقابلہ میں قاضی محمد احمد کاظمی (خلف الصدق مولوی محمد طفیل احمد صاحب مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل") کی ۱۹۴۶ء کے سنٹرل اسمبلی کے الیکشن میں حمایت کی جو کانگریس کے حمایت یافتہ تھے۔

مدتوں سے میں قرآن فہمی کی بہت سی تحریکات کا ذکر سنتا چلا آیا تھا جس میں مولوی فراہی، مولوی احسن اصلاحی اور سید قطب شہید مصری اور مولوی مودودی کے ناموں کے

ساتھ آپ کا نام بھی سنا تھا لیکن اس سلسلے میں میرا مسلک وہی تھا جو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ اس بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان خصوصاً شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا مسلک ہی مشعل راہ ہے۔ اسی لئے کبھی آپ کی تحریک کی طرف اتنی بھی توجہ نہ ہوئی جس قدر کہ مودودی صاحب کی طرف ہوئی تھی۔

حرف مطلب

____________________ القرآن اکادمی بمبئی و دہلی

جس نے الفی (ہر سطر الف سے شروع ہونے والی) قرآن کریم کی اشاعت کا ایک مثالی کارنامہ انجام دیا ہے اس میں میرے شریک کار بلکہ بانی القرآن اکادمی برادم مکرم نورالدین صاحب آزاد نے آپ سے ۱۹۸۵ء میں ملاقات اور قرآن پاک سے آپ کے والہانہ شغف کا ذکر ریاض سعودی عربیہ میں ۱۹۸۷ء میں آکر مجھ سے کچھ اس انداز سے کیا کہ آپ کی تحریک کے مالہ وماعلیہ کے لئے کھوجنے کی ایک طلب پیدا ہوئی اور ابھی چند ماہ پیشتر دہلی سے واپسی پر آپ کے ریاض کے ایک حلقہ میں شرکت کا موقع ملا۔ سوء اتفاق اس روز مہمان خصوصی جماعت کی طرف سے جدہ سے ایک صرف کثیر پر بلائے ہوئے ایک جواں سال صاحب زادے تھے انہوں نے بیعت سلوک کی اس قدر سختی سے مخالفت کی اور اسے بدعت سیئہ قرار دیا کہ آپ سے اور آپ کی تحریک سے دلچسپی کا جو داعیہ پیدا ہوا تھا وہ بن کھلے ہی مرجھا گیا اس پر مستزاد یہ کہ تقریر میں ایسی غلط باتیں سننے میں آئیں جو کسی عالم سے ہونی ناممکن سی تھیں اور جب تقریر کے بعد میں نے ان کے قریب جاکر توجہ دلائی تو اپنی غلطیوں پر اصرار اور عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق بے تکی تاویلیں چنانچہ میں نے اپنی جذباتیت میں یہاں تک کہہ دیا کہ آپ عربی سے واقف ہی نہیں اس کے باوصف رفقائے مجلس ان کے جبہ و دستار سے بدستور مرعوب تھے چنانچہ میں نے اس حلقہ کے بعض شناسا حضرات سے آپ کا کچھ لٹریچر حاصل کیا جس میں سے میثاق پہلے بھی دہلی میں مولوی وحید الدین خاں صاحب کے ہاں نظر سے گزر چکا تھا اور بھی کتابچے تھے۔ ارادہ یہی تھا کہ ایسی جماعت کا جس کے سربر آوردہ اصحاب میں صاحب زادہ موصوف جیسے "واں کس کہ نداند و بداند کہ بداند" بر خود غلط افراد ہوں تحریری طور پر تار و پود ضرور بکھیروں گا...... چنانچہ آپ کا لٹریچر بنظر عمیق پڑھنا شروع کیا۔ اس لٹریچر نے یہ ستم ڈھایا کہ میں جو عشاء کے بعد جلد سونے کا عادی ہوں میری راتوں کی نیند اچاٹ کر دی اور تحریک شیخ الہندؒ نامی ضحنہ ہم کتاب نے تو آنکھیں کھول دیں اور بے ساختہ...... "کرشمہ دامن دل می

رشد کہ جا ایں جاست" والی کیفیت پیدا ہو گئی اور سب سے زیادہ دل میں یہ بات اتری کہ آپ نے اپنے منتسبین کو یہ تاکید کی کہ مجھ سے بیعت کرنے والے اگر کسی اہل حق سے پہلے بیعت سلوک کر چکے ہیں تو ان کے بتائے ہوئے اوراد و اذکار کا بدستور اہتمام کرتے رہیں..... مجھے یاد آیا کہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے شیخ حضرت میاں نور محمد صاحب کے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب جو قطبِ وقت اور مسندِ سلوک کے ممتاز مربی تھے انہوں نے اپنے سے کہیں خورد سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی خود میرے شیخ حضرت مدنیؒ اور شیخ الہندؒ کے مشترک شیخ قطب العالم حضرت مولوی رشید احمد صاحبؒ گنگوہی سے جب کسی نے دریافت کیا کہ آپ سید العلماء ہوتے ہوئے حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی سے کیوں بیعت ہوئے جبکہ وہ عالم نہیں۔ آپ نے فرمایا وہ سلوک و طریقت میں ہمارے راہنما ہیں البتہ مسائل شرعی میں انہیں ہمارا کہا ماننا ہو گا..... اسی طرح علماء سے رجوع کی طرف آپ نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ یہ بھی ہزار بار لائق تحسین ہے..... اللہ پاک آپ کو اور آپ کے ذریعے آپ کے جملہ رفقاء کو زیادہ سے زیادہ اخلاص و استقامت نصیب فرمائیں.....! یہ تقریباً ۶۱ سالہ ناکارہ و بیمار عاجز آپ کی جماعت کو تو کیا فائدہ پہنچا سکے گا! ہاں آپ سے اور آپ کے واسطے سے آپ کے رفقاء سے استقامت علی الحق، صحت و عافیت اور حسن خاتمہ کی دعاؤں کا ضرور طالب ہے۔ ایک بات کھٹکی تھی کہ "نبی امی کا امی امتی" لیکن آپ نے خود ہی توجہ دلانے پر اس سے اجتناب کر لیا۔

آخری گزارش..... ان تینوں باتوں پر پھر غور فرمائیں جو آپ رفقاء سے چاہتے ہیں۔
۱۔ سابقہ بیعت سلوک پر میری بیعت کو ترجیح دیں۔ ۲۔ اپنی آمدنی کا بیسواں حصہ تنظیم کو ضرور ادا کریں۔ ۳۔ صدقات واجبہ مستحق رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے بعد جماعت کے بیت المال میں دینے کی پابندی کریں۔

یہ امور تنظیمی طور پر ضروری ہوں تو ہوں لیکن شرعاً ان کی پابندی محل نظر ہے۔

تضییعِ اوقات کی معذرت کے ساتھ! طالب دعا ناکارہ
اختر ہاشمی

حالیہ پتہ پوسٹ بکس ۱۴۸۹ ریاض۔ سعودی عرب

(پ ن) حال ہی میں پتہ چلا کہ صاحب زادہ صاحب موصوف نے آپ سے بیعت فسخ کر دی اور جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ میری اس جسارت کے فوراً بعد ہی ہوا۔ اگر اس میں کوئی شر ہے اور میں اس کا سبب بنا ہوں تو اللہ پاک مجھے معاف فرمائیں!

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

ایک سے محترم قاضی زاہد الحسینی کا مکتوب

عزیز گرامی قدر عاکف سعید سلام مسنون!

ادعیہ وافیہ،

میثاق باقاعدہ آرہا ہے اور احقر اس کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہے۔ جو سعی بھی دینِ اسلام کی اشاعت اور تحفظ عن المطاعن کے لئے کی جائے اسے اللہ تعالےٰ قبول فرمادیں۔ آمین۔

نومبر ۱۹۸۸ء میں جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شائع ہوا ہے اس میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کے بارے میں گاندھی جی کا ایک تجزیہ یوں نقل کیا گیا ہے:۔

مولانا اکبر آبادی نے تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پنڈت سندر داس نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ مولانا آزاد بہت بڑے عالم و فاضل ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے ہم اُنکے مشوروں کے محتاج رہتے ہیں بلکہ معاملات میں ان کی رائے کو آخری رائے سمجھا جاتا ہے اور کانگریس کے اکثر فیصلے مولانا آزاد کی رائے کے مطابق ہوتے ہیں لیکن میں نے دیکھا ان میں روحانیت نہیں ہے اس کے برعکس مولوی حسین احمد مجھے ملتے ہیں تو میں ان میں روحانی کشش محسوس کرتا ہوں (مولانا اکبر آبادی نے مولوی حسین احمد کہا تھا) (ص ۶۸)

یہ بیان تو جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی کا ہے جو قابلِ رشک حافظہ کی بنیاد پر تحریر فرمایا ہے مگر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے برہان بابت ماہ نومبر ۱۹۶۱ء میں جو کلمات نقل کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

"ایک مرتبہ سندر لال جی نے بیان فرمایا کہ میں گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے سندر لال بھئی جو روحانیت مولانا حسین احمد میں ہے وہ کسی میں نہیں میں جب کبھی مولانا حسین احمد کے پاس بیٹھتا ہوں مجھے ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے اور میں ان کی طرف کشش

محسوس کرتا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا مذہب اگر یہ روحانی کشش پیدا نہ کرے تو وہ مذہب ہی کس کام کا ہے۔" (ص ۲۵۹)

کسی کے اس تبصرہ اور اختراعی حاشیہ سے حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی قدر و منزلت کم نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ اکرام مسلم کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اسی طرح اسی شمارہ کے ص ۷۰ پہ حضرت انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے تلامذہ میں صرف مولانا محمد چراغ کا اسم گرامی بھی محل نظر ہے۔ اسی پاکستان میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے چند نامور تلامذہ اور بھی ہیں جن میں مولانا عبدالقدیر صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی بفضلہ تعالیٰ علوم و معارف انوری کی اشاعت میں سرگرم عمل ہیں۔

یہ گناہ گار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی کا شاگرد رہا ہے۔ اسی رشتہ کی وجہ سے حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی نظر عنایت بھی رہی ہے احقر ان کے مزاج اور اخلاق کریمانہ کا کافی حد تک واقف ہے۔ میرے خیال میں ان کی زبان سے حضرت مدنی کے بارے میں مولانا حسین احمد ہی صادر ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

اگر یاد رہا تو جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض کر دیں۔ عریضہ کی رسیدگی کی اطلاع کے لئے واپسی لفافہ ارسال ہے۔ زیادہ دعا و سلام

مخلص

قاضی محمد زاہد الحسینی غفرلہٗ

ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات

۶ دسمبر کے انگریزی روزنامہ "فرنٹیر پوسٹ" پشاور میں شائع شدہ مکتوب

محترم ثوبیہ سعید کے مراسلے کے سلسلے میں جو آپ کے مؤقر اخبار میں ۲۶ نومبر کو شائع ہوا، میں کہنا چاہوں گا کہ محترمہ کی طرح بہت سے لوگ ڈاکٹر اسرار صاحب کے بارے میں مغالطہ کا شکار ہیں اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ کچھ نے تو موصوف کے نقطۂ نظر کا سرسری سا مطالعہ کیا ہے اور کچھ جانتے بوجھتے ان کی باتوں کو غلط معنی پہناتے ہیں۔ بات اتنی سی ہے کہ ڈاکٹر اسرار سچ کہنے کے عادی ہیں۔ کرکٹ، چادر و چار دیواری، تعلیم نسواں اور دیگر مسائل پر ان کا مؤقف بالکل واضح ہے اور اس میں کوئی ابہام ہرگز نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت کی تو کبھی نفی نہیں کی البتہ اس بات پر ضرور زور دیا ہے کہ دونوں صنفوں میں اختلاط نہیں ہونا چاہئے خواہ وہ تعلیم کا میدان ہو یا کوئی اور شعبۂ حیات۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کا یہ مؤقف منطق کے عین مطابق ہے کہ اکثریتی پارٹی کو بے چون وچرا اقتدار منتقل کیا جائے۔ ان کا اصرار ہے کہ عوام کے فیصلے کا احترام کیا جانا چاہئے۔ میں محترم قارئین سے درخواست کروں گا کہ ان کی دو کتابیں "استحکام پاکستان" اور "پاکستان اور مسئلہ سندھ" ضرور پڑھیں جو حال ہی میں شائع ہوئیں۔ ان میں ڈاکٹر صاحب نے ارباب اختیار کو واضح انتباہ دیا ہے کہ عوام کی آواز کی طرف سے کان بند نہ کئے جائیں۔ کہیں تاریخ اپنے آپ کو دہرانے پر نہ آ جائے اور خدانہ کرے کہ ہمیں ایسے ہی ایک صدمے سے پھر دوچار ہونا پڑے جو پہلے ہم مشرقی پاکستان میں دیکھ چکے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار نے اسلام کو ذاتی مقاصد اور مفادات کے حصول کیلئے اسلام کے ان نام نہاد علمبرداروں کی طرح کبھی نعرہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جو حصول اقتدار کی دوڑ میں اپنا تشخص کھو بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار کا مشن اسلام کا صحیح معنوں میں احیاء اور غلبۂ دین ہے اور اس معاملے میں ان کے نظریات واضح اور پوری طرح متعین ہیں۔ اس کے لئے وہ آنحضورؐ کی سیرت مطہرہ سے اخذ کردہ طریق کار بیان کرتے ہیں جو خوب سمجھ میں آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے فکر کا تانا بانا قرآنی تصورات اور احادیث نبویؐ پر مشتمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی نظام یعنی دین ہے اور اس کا پھر سے قیام صرف انقلابی طریقہ کار ہی سے ممکن ہے۔ ان کا فلسفۂ انقلاب حضورؐ کی مکی اور مدنی زندگی کے چھ یا سات ادوار کی تشریح وتشکیل کے سوا کچھ اور نہیں۔

سیاسی سرگرمیوں اور انتخابات کے بارے میں بھی ڈاکٹر اسرار کی سوچ صاف اور سادہ ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ آزادانہ ماحول میں سیاست کا تسلسل ملک کی سلامتی کیلئے لازم ہے اور اس کی اہمیت پر جتنا زور دیا جائے کم ہے کہ لوگوں میں ملک کے معاملات کو چلانے میں شرکت کا احساس موجود رہنا چاہئے۔ انتخابات موجودہ نظام کو چلانے والے ہاتھ بدلنے کیلئے ضروری ہیں ورنہ کوئی آمرانہ سلسلہ اور موقع پرستوں کا کوئی ٹولہ ملک کو تباہی کے کنارے پر پہنچا کر دم لے گا۔ تاہم اس ملک میں اسلام کا احیاء اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر دین کے غلبہ کا حصول انتخابات اور ووٹ کے ذریعے ممکن نہیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایک انقلابی طریقہ کار ہی ضروری ہو گا جو اس موجودہ استحصالی نظام کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دے جو معاشی عدم مساوات اور غیر اسلامی تصورات پر قائم ہے۔ یہی طریقہ ہے جس سے سماجی انصاف حریت، مساوات اور اخوت پر مبنی ایک معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ میں قارئین کو مشورہ دوں گا کہ ان کے نظریات کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے ڈاکٹر اسرار صاحب کے لٹریچر کا ضرور مطالعہ کریں۔

اکرم عبداللہ۔ پشاور

۱۰۵۰ رشتے

کی فہرست میں ہر معیار، ذات اور برادری سے رشتے کا انتخاب خود فرمائیں۔ معلومات کے لئے -/۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال فرمائیں۔

فلاحی ادارہ۔ توکل مسجد گارڈی کھاتہ۔ حیدرآباد سندھ

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان۔
فون: ۲۲۱۵۹۸-۳۱۲۷۵۴

SV ADVERTISING

Jawad
Products

We are manufacturing and exporting ready made garments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedlinen, cotton bags, textile piece goods etc.

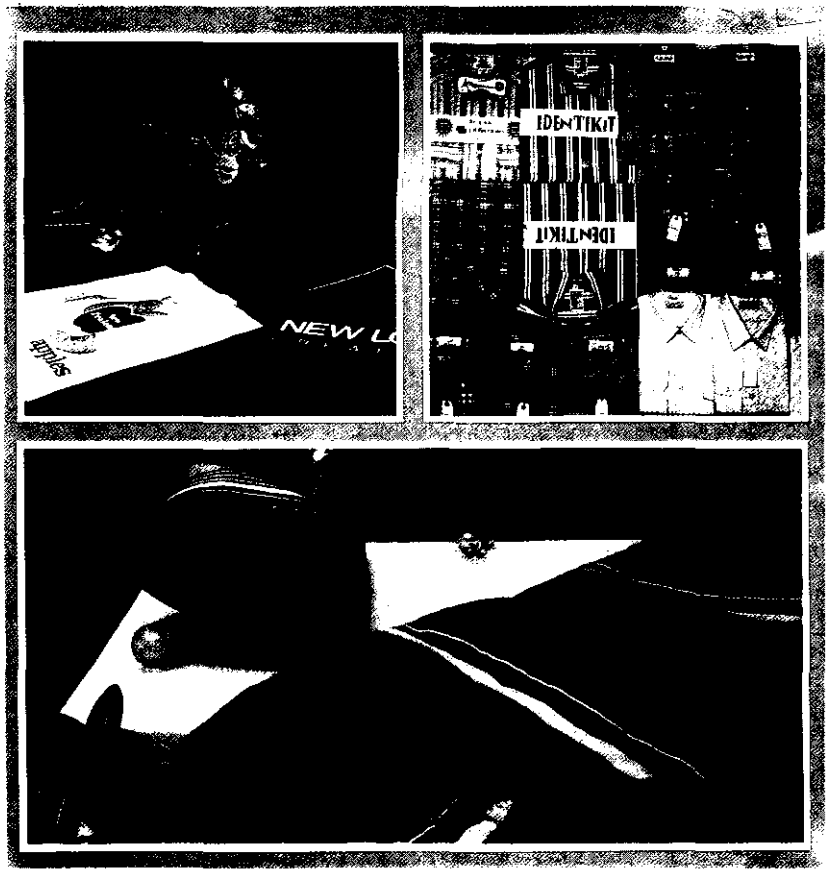

For further details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd L No 7360
Vol 38 No 1
January 1989